اسلام کا
عائلی نظام

مولانا سید جلال الدین عمری

ترتیب

اسلامی خاندان کے خدوخال ۵۵

✪ چند معاشرتی مسائل ۱۸۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طبع چہارم

'اسلام کا عائلی نظام' کا چوتھا ایڈیشن اس وقت پریس جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اسے علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب کی متعدد بحثیں موجودہ حالات کے پس منظر میں اہمیت کی حامل ہیں۔ اس وقت عالمی سطح پر نظام خاندان ہی زیر بحث ہے۔ کتاب کے شروع میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے خاندان کی ضرورت اور اہمیت واضح کی گئی ہے۔ زمانہ نزول قرآن میں عرب کے خاندانی اور قبائلی نظام کی تفصیل اور اس میں اسلام نے جو بنیادی اصلاحات کیں ان کا تذکرہ مستند حوالوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اختصار کے ساتھ اسلامی خاندان کے خدوخال واضح کیے گئے ہیں اور اہل خاندان کے حقوق و فرائض بیان ہوئے ہیں۔

عورت سے متعلق بعض احکام شریعت کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے بنیادی حقوق اور عدل و مساوات کے خلاف ہیں۔ ان میں مساجد میں خواتین کی حاضری اور با جماعت نماز میں مردوں کے ساتھ ان کی شرکت، نکاح میں ولی یا سرپرست کا اختیار، کفو اور برابری کا مسئلہ، مرد کی قوامیت اور عورت اور اجتماعی مناصب جیسے مسائل شامل ہیں۔ یہ مسائل مسلم معاشرہ میں بھی زیر بحث رہتے ہیں اور نئے حالات کے تحت نئی آراء اختیار کرنے کے مطالبات بھی کیے جاتے ہیں۔ کتاب میں ان موضوعات پر قرآن و سنت اور فقہ کی روشنی میں متوازن رائے ظاہر کی گئی ہے۔

موجودہ حالات میں عورت اور معیشت کا موضوع بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ کتاب میں اس پر تفصیل سے اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ Muslim Women and Economic Enterprise کے عنوان سے کتابچہ کی صورت میں مرکزی مکتبہ اسلامی سے شائع ہو چکا ہے۔

امید ہے، اس کتاب کے ذریعہ اسلام کے مطلوبہ نظامِ خاندان کے خدوخال نمایاں ہو کر سامنے آئیں گے اور ان بیش تر سوالات کے جوابات بھی ملیں گے جو اس پر کیے جاتے ہیں۔ کتاب کا انگریزی اور ہندی ترجمہ طبع ہو چکا ہے۔

جلال الدین عمری

۱۹/اپریل ۲۰۱۷ء/ ۲۲/رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

پیش لفظ

خاندان سماج کا قدیم ترین ادارہ ہے۔ اس کی ضرورت عہدِ ماضی میں بھی تھی، زمانۂ حال میں بھی ہے اور مستقبل کا انسان بھی اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ جب بھی خاندان کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوئی اس کے مقاصد پورے ہوئے اور وہ مرکزِ سکون و راحت بنا رہا۔ اس کے برخلاف جب وہ تخریب کا شکار ہوا تو اس کی افادیت مجروح ہوئی اور اس کے برکات وثمرات سے دنیا محروم ہوتی چلی گئی۔ موجودہ دور جن سنگین مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک خاندان کی تباہی بھی ہے۔ آج نظامِ خاندان کو غلط رسوم و رواج، نامعقول قاعدوں، ضابطوں، مذہب کی غلط تعبیرات اور مادّیت کے غلبہ نے کم زور سے کم زور تر کر دیا ہے۔ خاندان کا ایک بوسیدہ ڈھانچہ رہ گیا ہے اور اس کی روح نکل چکی ہے۔ خاندان میں الفت ومحبت کی جو خوش گوار فضا تھی وہ ختم ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ خودغرضی اور مفاد پرستی نے لے لی ہے۔ خاندانی رشتے اور تعلقات اس طرح متاثر ہو رہے ہیں کہ فرد خاندان کے لیے اور خاندان فرد کے لیے اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔ اب تو خاندان کی افادیت ہی زیرِ بحث ہے اور خاندان کی قید و بند سے آزاد زندگی کا رجحان پرورش پا رہا ہے۔ اس لیے وقت کا لازمی تقاضا ہے کہ خاندان کی ضرورت اور اہمیت محسوس کی جائے اور صحیح نہج پر اس کی تعمیر ہو۔ اس کے بغیر اس کے زوال کو روکا نہیں جاسکتا۔

دنیا پر اسلام کے بے شمار احسانات ہیں۔ اس کا ایک عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے خاندان کا ایک مفصل نظام پیش کیا۔ مرد و زن کا رشتہ عدل و انصاف کی بنیاد پر استوار کیا، افرادِ خاندان کے حقوق و واجبات کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا اور ان کے درمیان ہم دردی، محبت اور حسن سلوک کا ماحول پیدا کیا۔ اس نے خاندان کی تعمیر میں قانون اور اخلاق دونوں سے مدد لی اور اسے روح و قالب کے اعتبار سے ایک جامع اور مکمل نظام کی شکل عطا کی۔

اس وقت اس موضوع پر ایک حقیری کوشش آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کے شروع میں خاندان کی ضرورت و اہمیت واضح کی گئی ہے۔ پھر عربِ جاہلیت کے خاندانی نظام کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں، توقع ہے کہ اسلام کے تعمیری اور اصلاحی اقدامات کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکے گا۔ اس کے بعد بہت ہی اختصار کے ساتھ یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ اسلام کس طرح خاندان کو معاشرے کے ایک صالح اور مضبوط ادارے کی حیثیت سے وجود میں لاتا اور اسے فروغ اور استحکام عطا کرتا ہے۔ وہ خاندان کی مادی ضرورتوں اور اس کے اخلاقی تقاضوں میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کرتا، وہ دونوں کو پوری اہمیت دیتا اور ان میں کسی بھی پہلو سے کوتاہی ہوتو اس کی اصلاح کی مناسب تدابیر اختیار کرتا ہے۔

اس کتاب میں جن مسائل سے تعرض کیا گیا ہے ان میں سے بعض پر میں نے اپنی دوسری تالیفات اور مقالات میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہاں ان کے سلسلے میں اجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اسلام کے نظامِ خاندان کے مختلف پہلوؤں پر مجھے کبھی کبھی لکھنے یا اظہار خیال کے مواقع ملتے رہے ہیں۔ ان میں اس موضوع سے متعلق جو سوالات ابھرتے ہیں ان کا اسلام کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح کی بعض تحریریں اور خطابات نظرِ ثانی اور حذف و اضافہ کے بعد کتاب میں شامل کرلیے گئے ہیں۔ ان میں بعض اہم سماجی اور معاشرتی مسائل اور فقہی احکام شامل ہیں۔

میں نے اپنی تصنیفی زندگی کے ابتدائی دور میں 'اسلام کا عائلی نظام' کے عنوان سے ماہ نامہ 'زندگی' رام پور میں مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ابھی یہ نامکمل ہی تھا کہ کتابی شکل میں شائع ہوگیا۔ پیشِ نظر کتاب کے لیے گو اسی عنوان کا انتخاب کیا گیا ہے لیکن اس کا بہت تھوڑا سا مواد حکّ و اصلاح کے بعد اس میں شامل کیا گیا ہے۔ باقی تمام تحریریں اس کے بعد کی ہیں۔ اس طرح اب یہ کتاب بالکل نئی شکل میں پیش ہورہی ہے۔ میں نے اسے بہتر بنانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ کوشش بہرحال ایک طالب علم کی ہے۔ اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ وہ اس میں جو غلطی یا خامی محسوس کریں اس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ اس کی اصلاح کردی جائے گی۔ دعا ہے کہ یہ حقیر خدمت اسلام کے عائلی نظام کے تعارف کا ایک مفید ذریعہ ثابت ہو، اللہ تعالیٰ اسے محض اپنے فضل وکرم سے شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس عاجز کو اس کے اجر وثواب کا مستحق بنا دے۔

جلال الدین عمری

۲۶ر ستمبر ۲۰۰۶ء/ ۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

خاندان اور قبیلہ

- خاندان: اہمیت اور مختصر تاریخ
- کیا خاندان ضروری ہے؟
- عرب کا خاندانی اور قبائلی نظام اور اسلام کی اصلاحات

خاندان

(اہمیت اور مختصر تاریخ)

افراد سے خاندان وجود میں آتا ہے۔ خاندان ریاست کی پہلی منزل اور اس کی اساس ہے۔ خاندان اور ریاست مل کر معاشرہ کی صورت گری کرتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔

خاندان کا آغاز کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ اس کے کیا عوامل اور محرکات تھے؟ اس کا جواب انسان کی فطرت اور اس کی تاریخ میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

انسان اجتماعیت پسند ہے

روئے زمین پر جب سے انسان کا وجود ہے وہ اپنے ہم جنس افراد کے ساتھ مل جل کر رہ رہا اور اجتماعی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ طبعاً ان سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس سے اس کی فطرت انکار کرتی ہے۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ فطری طور پر اجتماعیت پسند ہے۔ تاریخ کے کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی، جس میں اس نے ابنائے نوع سے کٹ کر انفرادی زندگی گزاری ہو۔

انسان اجتماعیت کا محتاج ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ ہر قدم پر دوسرے انسانوں

کے تعاون کا محتاج ہے۔ اس کے بغیر وہ غذا، لباس، دوا، علاج اور مکان جیسی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کرسکتا۔ انسان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے غذا کا جو لقمہ لیتا ہے اور تن ڈھکنے کے لیے جو کپڑا استعمال کرتا ہے اس میں بہت سے لوگوں کی کوشش اور محنت شامل ہوتی ہے۔ اسی تعاون سے انسان کی زندگی کی تمام تر رونق قائم ہے اور تہذیب وتمدن کی ساری رنگینیاں اور ہوش ربا جلوے اسی تعاون کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بغیر انسان کی دنیا نہ صرف یہ کہ بے نور ہوجائے گی، بلکہ اس کے وجود اور بقا ہی کو شدید خطرہ لاحق ہوجائے گا۔

خاندان کا آغاز

انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کی ماں سے اس کا اوّلین رشتہ استوار ہوتا ہے، پھر بہت جلد باپ اس میں شریک ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد بھائی، بہن اور دور نزدیک کے ان تمام افراد سے اس کے تعلقات قائم ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس سے خون کا رشتہ رکھتے ہیں۔ ان ہی سے اس کا خاندان تشکیل پاتا ہے اور ان ہی کے درمیان اس کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ خاندان سے باہر کے افراد سے اس کا تعلق اس ابتدائی مرحلہ میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ان سے ربط وضبط کا سلسلہ بالعموم بعد میں شروع ہوتا ہے۔

خاندان کی ضرورت

انسان اپنے سفرِ حیات میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ ایک مرحلہ پیدائش اور بچپن کا ہے، جس میں وہ اپنی بقا اور ضروریات کی تکمیل میں سراسر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کا خاندان اس کی نگہ داشت اور پرورش کرتا ہے، اس کی ضروریات پوری کرتا اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ میدانِ عمل میں اپنا حصہ ادا کرسکے۔ استطاعت کے ہوتے ہوئے خاندان اس میں کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ کبھی اس میں

غفلت ضرور ہوجاتی ہے، لیکن قصد و ارادہ بالعموم شامل نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس مشکل کام میں بعض اوقات خاندان سے باہر کے افراد کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔

انسان کی زندگی کا دوسرا مرحلہ عہدِ شباب کا ہے۔ اس مرحلے میں وہ خاندان کا ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اس کی مدد کا ضرورت مند بھی ہوتا ہے اور اس کی مدد کر بھی سکتا ہے۔ اس مرحلہ میں وہ ان سے جتنا تعاون حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ ان کی معاونت کے موقف میں ہوتا ہے۔ چناں چہ عام طور پر خاندان کو اس کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا مرحلہ پیری اور بڑھاپے کا ہے، جو جوانی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس میں آدمی ضعف و ناتوانی کا شکار ہوجاتا ہے، اس کی قوتیں اور توانائیاں آہستہ آہستہ کم زور پڑنے لگتی ہیں۔ کبھی یہ مرحلہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ آدمی بچپن ہی کی طرح لمبی مدت کے لیے خاندان کی توجہ اور خبر گیری کا دوبارہ محتاج ہوجاتا ہے۔

یہ مراحل بالعموم فطری رفتار سے آتے ہیں، لیکن بعض اوقات طبعی نقص، مرض، کسی ناگہانی حادثہ یا اس طرح کے کسی دوسرے سبب سے آدمی کا خاندان پر انحصار طویل عرصہ تک اور کبھی زندگی بھر کے لیے ہو جاتا ہے اور خاندان کی یہ ذمے داری سمجھی جاتی ہے کہ وہ اس کی دست گیری اور خدمت کرتا رہے۔

خاندان کی اہمیت

افراد خاندان کے درمیان ہم دردی اور تعاون و تناصر کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ فطری طور پر اور بغیر کسی دباؤ کے انجام پاتا رہتا ہے۔ خاندان کے بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ انھیں افراد خاندان مل جل کر خود ہی حل کرتے رہتے ہیں۔ اسے وہ بوجھ نہیں بلکہ اپنی ذمے داری تصور کرتے ہیں۔ خاندان کے ہر فرد کو ایک طرح کا اطمینان ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی ضرورت پیش آئے گی خاندان کا تعاون اسے حاصل ہوگا۔

اس طرح خاندان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کے چاروں طرف اس کے بہی خواہ اور ہم درد افراد کا ایک حلقہ موجود ہوتا ہے، جن کے درمیان وہ خود کو محفوظ و ماموں پاتا ہے اور جو مشکلات میں اس کے کام آتا ہے۔

حفاظت اور صیانت کا جذبہ

افرادِ خاندان کے درمیان ایک دوسرے کی حفاظت اور صیانت کا شدید جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں کسی شخص کی جان، مال اور عزت و ناموس پر حملہ ہو تو پورا خاندان اسے اپنے اوپر حملہ تصور کرتا اور ظالم سے انتقام کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہ بات بڑی ہی بے غیرتی کی خیال کی جاتی تھی کہ کسی پر حملہ ہو اور اس کا خاندان خاموش تماشائی بنا رہے اور اس کا دفاع نہ کرے۔

خاندان کی حفاظت اور اس کے دفاع کے لیے اس کا طاقت ور اور مضبوط ہونا ضروری تھا۔ جو خاندان مضبوط ہوتا اس کے افراد خود کو زیادہ محفوظ پاتے۔ اس سے تعلق رفعتِ شان اور عزت و نام وری کا ذریعہ سمجھا جاتا اور آدمی اس پر ناز کرتا۔ کسی کم زور خاندان میں پیدا ہونا آدمی کے لیے ذلت اور پستی کا باعث تھا۔ وہ خود بھی اپنے کو کم زور سمجھتا اور دوسرے بھی اسے کم زور ہی کی حیثیت سے دیکھتے۔

خاندان سے تعلق کے اسباب

جب آدمی یہ دیکھے گا کہ خاندان اس کی پرورش کا بار اٹھا رہا ہے، اس کے تعاون سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں، مشکلات میں اس کے کام آ رہا ہے، اسے جان، مال اور عزت و ناموس کا تحفظ فراہم کر رہا ہے اور اس کے دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہے تو خاندان سے اس کا تعلق برقرار ہی نہیں رہے گا بلکہ اس میں لازماً اضافہ ہوتا رہے گا اور اس سے کٹ کر رہنا یا علیٰحدہ ہونا وہ پسند نہ کرے گا۔

خاندان سے انسان کا جذباتی تعلق بھی ہوتا ہے۔ وہ اس سے دلی قربت اور

یگانگت محسوس کرتا ہے اور رنج وراحت میں اسے شریک دیکھنا چاہتا ہے۔ افراد خاندان اس کی خوشیوں کو دوبالا کرتے ہیں۔ ان کی محبت اور ہم دردی اس کے درد و الم کو کم کرتی اور اسے سکون فراہم کرتی ہے۔ خاندان اس کی ضرورت بھی ہے اور اس کے لیے وجہِ سکون بھی۔

خاندانی زندگی انسان کی خصوصیت ہے

حیوان اور انسان کے درمیان ایک بڑا فرق خاندان کا بھی ہے۔ حیوان کا کوئی خاندان نہیں ہوتا اور انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ خاندانی زندگی گزارتا ہے۔ حیوان میں نر اور مادہ جنسی تسکین کے لیے ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔ اس سے ان کی نسل بھی پھیلتی رہتی ہے۔ وہ دونوں، خاص طور پر مادہ اپنی نسل کی اس حد تک پرورش اور حفاظت کرتی ہے کہ وہ خود سے زندہ رہ سکے۔ پھر ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور وہ بالکل الگ ہوجاتے ہیں۔ ان کے درمیان ہم دردی اور محبت کے جذبات بھی ختم ہوجاتے ہیں، اصل وفرع کا احساس جاتا رہتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں۔ خاندان کے لیے ضروری ہے کہ اصل وفرع کا رشتہ دائمی ہو اور اس کی بنیاد پر تعلقات استوار ہوں۔ حیوان کی فطرت اس سے ناآشنا ہے۔ اس وجہ سے ان کا خاندان ہوتا ہے اور نہ ان کے اندر حقوق اور ذمے داریوں کا تصور پایا جاتا ہے۔

انسان کا وجود بھی مرد اور عورت کی شکل میں ہے۔ ان کے درمیان جنسی جذبات پائے جاتے ہیں۔ ان کی تسکین سے ان کی نسل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن انسان اس پہلو سے حیوان سے مختلف ہے کہ اس کا اپنی نسل سے تعلق وقتی اور عارضی نہیں، بلکہ دائمی اور مستقل ہوتا ہے۔ وہ اصل اور فرع میں فرق و امتیاز کرتا ہے، اسے کبھی فراموش نہیں کرتا۔ اسی بنیاد پر اس کے اندر تعاون کا جذبہ اور حقوق اور ذمے داریوں کا تصور ابھرتا ہے اور خاندان وجود میں آتا ہے۔

خاندان کی شکلیں

خاندان چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں ماضی سے چلی آرہی ہیں۔ ان سب کو تین بڑے عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے:-

۱- مختصر خاندان: اسے اصطلاح میں نیوکلیر خاندان (Nuclear Family) کہا جاتا ہے۔ اس میں آدمی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی ماں باپ اور بہت ہی قریبی رشتہ دار بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان سب کے کھانے پینے اور رہائش کا نظم مشترک ہوتا ہے۔ بعض محققین اسے خاندان کی سب سے قدیم شکل تصور کرتے ہیں۔ آج بھی خاندان کی یہ شکل عام ہے۔

۲- نیوکلیر خاندان سے وسیع خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔ اسے توسیعی خاندان (Extended Family) کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں آدمی اپنی ایک یا ایک سے زیادہ بیویوں اور بچوں کے ساتھ الگ مکان میں رہتا ہے۔ اس کے شادی شدہ بچوں میں سے بعض اپنا خاندان الگ بناتے ہیں اور بعض اس کے ساتھ رہائش اختیار کرتے ہیں۔ یہ گو ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں، لیکن ان میں سے ہر کمانے والا فرد اپنی مختصر اکائی یا بیوی بچوں کے مصارف خود برداشت کرتا ہے۔ اگر کھانے پینے کا انتظام مشترک ہو تو وہ اپنی آمدنی یا خرچ کی مناسبت سے اس میں حصہ لیتا ہے۔

۳- خاندان کی ایک شکل مشترک خاندان (Joint Family) ہے۔ اس میں ایک باپ کی اولاد خاص طور پر نرینہ اولاد اور ان کے بچے سب مل کر رہتے اور خاندان کی معاشی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے اور رہائش کا نظم بھی ایک ہی جگہ یا ایک ہی مکان میں ہوتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ خاندان کا یہ نظام تاریخ کے زرعی دور میں وجود میں آیا، جب کہ معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔ زراعت میں جتنے افراد شریک ہوں وہ بہتر طریقہ سے ہوسکتی تھی۔ اس میں کاشت کے رقبہ کو بڑھانا اور

زرعی زمینوں پر قبضہ کرنا بھی آسان تھا۔ بڑے خاندان سے اس کے افراد کو زیادہ تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں خاندان کی یہی شکل تھی، بعد میں اس کی دوسری شکلیں وجود میں آئیں۔

مشترک خاندان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک بااختیار سربراہ ہوتا ہے اور خاندان کے سارے افراد اس کے احکام اور ہدایات کے پابند ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف توسیعی خاندان یا نیوکلیر خاندان میں کسی کو سربراہی کا مقام حاصل نہیں ہوتا، البتہ بزرگ خاندان کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ مشورے دے سکتا ہے، انھیں اہمیت بھی دی جاتی ہے، لیکن ان کی پابندی ضروری نہیں خیال کی جاتی۔

پدری خاندان اور مادری خاندان

دنیا کے بیش تر ملکوں اور خطوں میں پدری خاندان کا سلسلہ رائج ہے۔ اولاد باپ کی سمجھی جاتی ہے۔ سارے اختیارات باپ کو حاصل ہوتے ہیں اور وہ باپ کی وارث بھی ہوتی ہے۔ ماں کے قانونی حقوق نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض غیر متمدن علاقوں میں مادری خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔ اس میں شادی کے بعد مرد عورت کے گھر رہتا ہے۔ عورت گھر کی مالکہ ہوتی ہے۔ بچے اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور جائداد اسی کی سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ متمدن دنیا نے اسے عملاً رد کر دیا ہے۔

مغرب میں آزادانہ شہوت رانی عام ہوچکی ہے۔ اس کے نتیجہ میں مادری سلسلہ کی ایک نئی شکل ابھر رہی ہے۔ جنسی تعلقات میاں بیوی کے درمیان محدود نہیں ہیں۔ ایک مرد کے متعدد عورتوں سے اور ایک عورت کے کئی ایک مردوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ اس میں ماں تو متعین ہوتی ہے اس لیے کہ وہ بچہ کو جنم دیتی ہے، لیکن بچہ کس کے نطفہ سے ہے اس کا قطعی علم نہیں ہوسکتا، اس لیے باپ کا تعین دشوار ہے۔ چناں چہ اس

طرح بچہ ماں ہی کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ وہی اس کی ذمے دار ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مرد کی خانگی ذمے داریاں ختم ہو رہی ہیں اور عورت کی ذمے داریاں بڑھ رہی ہیں۔ یہ دراصل بیسوائی اور قحبہ گری کی ایک شکل ہے، جو خاندان کی ہیئت ہی کو بگاڑ رہی ہے اور پورے معاشرہ کے لیے تباہ کن ہے۔

خاندان معاشرہ کی اساس ہے

خاندان چھوٹے اور بڑے ہوسکتے ہیں۔ ان کے مجموعے سے سماج اور معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ خاندان کے استحکام اور عدمِ استحکام سے معاشرے کا استحکام اور عدم استحکام وابستہ ہے۔ خاندان کی بنیادیں مضبوط ہوں تو معاشرے کو مضبوطی اور استواری حاصل ہوگی۔ یہ کم زور ہوتو پورا معاشرہ ضعف اور اضمحلال کا شکار ہوگا۔ ایک ایک اینٹ کی پختگی سے پوری عمارت مضبوط ہوتی ہے۔ خام اور کم زور اینٹوں سے مضبوط عمارت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ خاندان وہ بنیادی پتھر ہے کہ یہ اپنی جگہ سے ہٹتا ہے تو پورے معاشرہ کی چولیں ہل جاتی ہیں اور تعلقات میں بگاڑ اور فساد رونما ہونے لگتا ہے۔ خاندان کے ٹوٹنے سے وہ دائرہ یا سرکل ٹوٹ جاتا ہے جس سے انسان کا قلبی تعلق ہوتا ہے۔ وہ لوگ جنھیں انسان اپنا سمجھتا ہے، جو اس سے انتہائی قریب ہوتے ہیں، وہ بھی دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ تمام تعلقات جو خاندان کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور اس کی بقا سے وابستہ ہیں، اِس کے ٹوٹتے ہی ختم ہوجاتے ہیں اور انسان خاندان کے سکون سے محروم ہوجاتا ہے۔ خاندان کا ٹوٹنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا خسارہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ زیادہ دنوں تک اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

کیا خاندان ضروری ہے؟

خاندان کا زوال

دور حاضر میں خاندان کی اہمیت اور افادیت تسلیم شدہ نہیں رہ گئی ہے۔ خاندان کے پورے نظام ہی پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات مختلف نوعیت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں عورت کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ خاندان بعض معاشی عوامل کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اب وہ عوامل ہی نہیں رہے۔ جو لوگ ریاست کے کلیت پسند تصور کے قائل ہیں وہ خاندان سمیت تمام اجتماعی اداروں کو ریاست کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے ماضی کا ایک ایسا ادارہ تصور کرتے ہیں، جس کی موجودہ ترقی یافتہ دور میں چنداں ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ وہ کبھی ناگزیر تھا بھی تو اب نہیں رہا۔ خاندان کے جن فوائد کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ریاست کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ مختلف تصورات پورے نظام خاندان پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور وہ اپنی اہمیت کھوتا جا رہا ہے۔ چناں چہ مغرب میں خاندان بری طرح شکست و ریخت سے دوچار ہے۔ مرد اور عورت آزاد شہوت رانی کے قائل ہیں۔ وہ نکاح کی بندش اور خاندان کی تعمیر کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے۔

خاندان کے خلاف دلائل

خاندانی نظام کے خلاف جو دلائل دیے جاتے ہیں یہاں ان کے تجزیہ کی کسی قدر کوشش کی جائے گی۔

۱- خاندان مرد کے اقتدار کی علامت

خاندان کا ادارہ مرد کی عورت پر بالادستی کی یادگار ہے۔ یہ اس لیے وجود میں آیا کہ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں محبوس رکھا جائے، تاکہ وہ مرد کی تابع بن کر رہے۔ یہ عورت پر ظلم و زیادتی کی ایک شکل ہے۔ فکر و عمل کی آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ یہ حق مرد اور عورت دونوں ہی کو ملنا چاہیے۔ مرد اپنی جدوجہد اور تگ و دو میں آزاد رہے اور عورت کو خانہ قید رکھا جائے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ خاندان کی اساس مرد کے جبر و ظلم اور عورت کی محکومی پر ہے۔ خاندان مرد اور عورت دونوں کی فطری ضرورت ہے۔ وہ ان کے لیے سکون کا مرکز ہے۔ اس کے بغیر ان کی زندگی جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافر کی زندگی ہوگی۔ خاندان دونوں کا مشترک ادارہ ہے اور وہ مل جل کر اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ نہ تو مرد اس کی بربادی چاہتا ہے اور نہ عورت اسے گوارا کرتی ہے۔ اس لیے اس میں کسی کی محکومی اور کسی کی فرماں روائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۲- ذرائعِ معاش پر مرد کا قبضہ

عورت خاوند کے ماتحت رہنے پر اس لیے مجبور تھی کہ معاش کے تمام ذرائع و وسائل پر مرد کا قبضہ تھا اور عورت بقائے حیات کے لیے اس کی دست نگر تھی۔ معاشی مجبوری نہ ہوتی تو مرد کی غلامی کا طوق اس کی گردن میں نہ ہوتا۔ آج صورتِ حال بدل گئی ہے۔ اسے معاشی جدوجہد کی آزادی ہے اور وہ بڑی حد تک معاشی استقلال کی طرف گام زن ہے۔ اس لیے اب وہ مرد کے تابع رہ کر احتیاج کی زندگی گزارنے پر مجبور نہیں ہے۔

یہ بات کہ عورت معاشی حیثیت سے مرد کی دست نگر تھی، اس لیے وہ اپنا پیٹ پالنے اور آذوقۂ حیات حاصل کرنے کے لیے خاندانی زندگی گزار رہی تھی، حقیقت کے خلاف ہے۔ دنیا دیکھتی چلی آرہی ہے اور آج بھی دیکھ رہی ہے کہ ایک شخص مفلوج ہے،

بستر پکڑے ہوئے ہے، کسی کی کفالت تو کیا کرے گا دوسروں کے لیے مستقل بوجھ بنا ہوا ہے، ہر وقت خدمت اور تعاون کا محتاج ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی اس سے محبت کرتی اور اس کی خدمت کو اپنے لیے سعادت تصور کرتی ہے اور کسی قیمت پر اس سے اپنا تعلق ختم کرنا نہیں چاہتی۔ چشمِ عالم نے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ عورت علم و ہنر رکھتی ہے، ذی حیثیت ہے یا اس کے سامنے آسائش و راحت کے دوسرے امکانات ہیں، پھر بھی اس نے خاوند کے ساتھ غربت و افلاس کی زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ دنیا کی دولت و ثروت سے دست کش ہوجانا پسند کیا، لیکن حبالۂ عقد کو توڑنا گوارا نہ کیا۔ اس طرح کے ایک دو نہیں بے شمار واقعات کی آخر کیا توجیہ کی جائے گی؟ اگر یہ رشتہ محض معاش کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے تو اسے ان حالات میں ختم ہوجانا چاہیے۔

کہا جاتا ہے کہ سماج نے عزت و ذلت کے کچھ خود ساختہ معیار قائم کر رکھے ہیں، جن کی رو سے کسی عورت کا خاوند کے چنگل سے آزاد ہونا اس کے لیے ذلت و حقارت کا باعث تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے عورت ہر مصیبت برداشت کرکے شوہر کے ساتھ زندگی کے دن کاٹتی رہتی ہے۔ اس سماجی جبر کو خوشی اور رضا و رغبت کا نام دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کی نفسیات کے خلاف ہے کہ وہ کسی جابر و ظالم کو اپنے دل میں جگہ دے اور اس سے محبت کرے۔ آدمی کسی ناپسندیدہ شخص کو برداشت تو کرسکتا ہے، لیکن اس سے محبت و الفت کا تعلق قائم نہیں کرسکتا۔ میاں بیوی کے درمیان محبت کا جو رشتہ پایا جاتا ہے اسے سماج کا دباؤ ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مرد اور عورت کے درمیان ازدواجی تعلق کی بنیاد وہ محبت ہے جو فطری طور پر ان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ خاندانی نظام اسی جذبۂ الفت و محبت کو دوام عطا کرتا ہے۔ وہ ان کی فطری کشش کو عارضی یکجائی کا نہیں بلکہ مستقل رفاقت کا ذریعہ بناتا ہے۔ وہ ان کے سامنے کچھ ایسے اغراض و مقاصد رکھتا ہے،

جس کی تکمیل کے لیے انھیں پوری زندگی لگانی پڑتی ہے اور معاش کی ہزار اہمیت کے باوجود وہ اس سے بلند ہوکر سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۳- خاندانی تعلقات کی بنیاد معاش ہے

انسان کی نسل حیوان کی نسل سے بہت مختلف ہے۔ حیوان کی نسل بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑی ہوجاتی اور فطرت کی ہدایت و رہ نمائی میں زندگی گزارنے لگتی ہے، لیکن انسان کی نسل طویل عرصہ تک لطف و محبت اور توجہ اور عنایت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس میں تھوڑی سے غفلت اور کوتاہی بھی اس کے وجود اور اس کے مستقبل کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ خاندان کے نظام میں یہ طویل اور تھکا دینے والا عمل والدین بہ خوشی انجام دیتے ہیں۔ وہ اس کی حفاظت، نشو و نما اور تعلیم و تربیت میں اپنی توانائیاں صرف کردیتے ہیں۔ اس میں خاندان کے دوسرے افراد کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے بھی معاشی محرکات کارفرما ہیں۔ والدین اولاد کی پرورش اس لیے کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں ان کا سہارا ثابت ہو۔ جب ان کے قویٰ کم زور ہوجائیں اور وہ تگ و دو کے قابل نہ رہ جائیں تو ان کی اولاد ان کا معاشی بار اٹھائے۔ انھوں نے جس طرح اس کی خدمت کی ہے وہ ان کی خدمت کرے۔ یہ معاشی ضمانت کی ایک شکل تھی اور عملاً یہی ہوتا بھی تھا۔ ماں باپ اولاد کی نگہ داشت اور خدمت کرتے اور اولاد ان کی ضروریات پوری کرتی۔

یہ پورا فلسفہ کہ انسان محض معاشی محرک کے تحت اولاد کی پرورش کرتا اور اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے، اس کی فطرت سے متصادم ہے۔ اس میں اس کے پاکیزہ جذبات و احساسات کی توہین ہے۔ تاریخ کے طویل تجربات اس کے خلاف ہیں۔ اسے اگر درست مان لیا جائے تو انسان حیوان سے بدتر قرار پائے گا۔ حیوان بھی مستقبل کی معاشی فکر سے آزاد ہوکر اپنی نسل کی حفاظت اور پرورش کرتا ہے۔ فطرت نے اسے

اس کام کے لیے جو صلاحیت اور توانائی عطا کی ہے وہ پوری پوری صرف کرتا ہے۔ فضائے آسمانی میں اڑنے والا پرندہ یہ سوچ کر اپنی نسل کے لیے ایک ایک تنکا جمع کر کے گھونسلا نہیں بناتا اور ایک ایک دانہ چن کر اسے اس خیال سے نہیں کھلاتا کہ وہ آئندہ اس کی اسی طرح خدمت کرے گا۔ یہی حال تمام حیوانات کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فطری راہ نمائی کے تحت ہے، تو انسان کی اپنی نسل کے لیے کوشش ہی کو کیوں ایک معاشی تدبیر قرار دیا جائے؟ اس کی کیا معقول دلیل ہے؟

اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ اگر اولاد سے محبت اور ان کی خدمت کے پسِ پشت معاشی فکر کارفرما ہوتی ہے اور اسی کے لیے آدمی تگ و دو کرتا ہے تو متموّل والدین کو اولاد کی تمنا ہی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اولاد ہو تو اس کی پرورش کی فکر اور اس کی ترقی کی تمنا سے ان کا سینہ خالی ہونا چاہیے۔ کیا دولت مند ماں باپ اسی طرح سوچتے اور اس پر عمل کرتے ہیں؟ اس سے آگے آپ ایک ایسے بچے کا تصور کیجیے جو بالکل معذور اور اپاہج ہے، جس سے کسی نفع کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی، جو زندگی بھر والدین کے لیے بارگراں ہی بنا رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ ایک ماں اس مضغۂ گوشت کو اپنے سینے سے کیوں لگائے رکھتی ہے؟ کون سا جذبہ ہے جو باپ کو اس کی خبر گیری پر مجبور کرتا ہے؟ کیا کوئی شخص بہ سلامتیِ ہوش وحواس کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اس توقع پر ہے کہ وہ مستقبل میں ان کے لیے معاشی سہارا ثابت ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر حیوان کے اندر اس بات کا شدید داعیہ پایا جاتا ہے کہ وہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنا وارث اور جانشین پیدا کرے، تاکہ اس کی نسل جاری رہے۔ یہ داعیہ حیوان کے مقابلے میں انسان کے اندر شدید تر ہے۔ اگر یہ داعیہ سلب ہوجائے تو سطحِ زمین سے حیوان کا وجود بھی ختم ہوجائے گا اور نوعِ انسانی بھی باقی نہ رہے گی۔

۴- ریاست خاندانی ضروریات پوری کرے گی

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے اب خاندان کی وہ اہمیت نہیں رہی جو قدیم زمانہ میں تھی۔ اب یہ کام ریاست بہتر طریقہ سے کرسکتی ہے۔ بسا اوقات اولاد سے متعلق ذمے داریوں کا ادا کرنا والدین کے لیے دشوار، بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ ایک غریب اور نادار خاندان جو خود نانِ شبینہ کا محتاج ہے وہ اپنے بچے کی پرورش اور اس کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام کرسکتا ہے؟ معاشی طور پر کم زور ماں باپ ہی نہیں خوش حال والدین بھی بعض اوقات ان ذمے داریوں کو ادا نہیں کرپاتے۔ اس طرح کتنے ہی ہونہار ذہین اور قابل بچے، جو ملک و ملت کے کام آسکتے ہیں، ضائع ہوجاتے ہیں۔ ریاست اپنے وسیع ذرائع و وسائل کی بنا پر اس ذمے داری کو بہتر طریقے سے انجام دے سکتی ہے۔

اس مسئلہ پر کئی پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ریاست انسان کو بعض سہولتیں تو فراہم کرسکتی ہے لیکن خاندان کا بدل نہیں بن سکتی۔ دنیا کے کسی ادارہ کے پاس لطف و محبت کی وہ دولت نہیں ہے، جسے ماں باپ شب و روز اپنی اولاد پر نچھاور کرتے رہتے ہیں۔ ماں اپنی محبت بھری نگاہوں سے انسانیت، شرافت اور ہم دردی کا جو پاکیزہ درس اولاد کو دیتی ہے وہ کسی تربیت گاہ یا دانش کدہ سے اسے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کی لوریاں بچے کے لیے خواب آور ہی نہیں ہوتیں، بلکہ عداوت، نفرت اور کینہ و کدورت دور کرنے کا بھی باعث ہوتی ہیں۔ باپ کا دستِ شفقت اس کے دل و دماغ سے ناپاک جذبات کو جس خوبی سے نکال سکتا ہے وہ خوبی کسی دوسرے ہاتھ میں مشکل ہی سے آسکتی ہے۔

آج اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہو رہی ہیں۔ مہر و محبت اور بے غرض خدمت کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ انسان سفّاکی اور درندگی میں جنگل کے خوں خوار درندوں کو پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اس کی ستم رانیوں نے دنیا کو جہنم زار کر رکھا ہے۔ ان

حالات میں محبت اور ہم دردی کے جذبہ کو ابھارنے اور فروغ دینے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیا سرکاری تربیت گاہیں بچے کے اندر یہ خوبیاں پیدا کرسکتی ہیں؟ ایک دایہ بچے کو وقت پر دودھ پیش کرسکتی ہے، لیکن وہ پاکیزہ جذبات اس کے حلق کے نیچے اتار نہیں سکتی، جن کا مخزن صرف ماں کا سینہ ہوتا ہے۔

جہاں تک بچے کی پرورش، صحت اور تن درستی، تعلیم اور معاشی تحفظ کا سوال ہے یہ ایک فلاحی ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرے، تاکہ کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ رہے، دوا علاج سے محروم نہ ہو اور اس کی رہائش کا انتظام ہو۔ ان ہی بنیادی ضروریات میں تعلیم بھی داخل ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ کسی کو ناخواندہ اور جاہل نہ رہنے دے، تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور علمی ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے خاندان کو ختم کرنا یا بچے کو خاندان سے جدا کرنا ضروری ہے؟

بعض اوقات موجودہ دور کی مشینی زندگی کو اولاد کی تربیت کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ آج کا انسان اس قدر مصروف ہے کہ وہ اولاد کی مناسب نشو ونما اور تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ آج کے انسان کے ساتھ اتنے غیر ضروری لوازمات وابستہ ہوگئے ہیں کہ اس کی توجہ حقیقی فرائض اور ذمے داریوں سے ہٹ گئی ہے اور وہ روز بروز مسلسل غفلت کی نذر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ دور حاضر کے مادی تصورات نے انسان کو عیش و عشرت کا فریفتہ کر رکھا ہے۔ وہ اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے اور جہاں تک ہوسکے سماجی اور معاشرتی بندشوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس راہ میں ذمے داریاں چوں کہ رکاوٹ بنتی ہیں، اس لیے اس کے اندر ذمے داریوں سے گریز کا رجحان پرورش پا رہا ہے۔ وہ خاندان کی ذمے داریوں سے بھی ممکنہ حد تک بچنا چاہتا ہے، اس کے لیے وہ بچوں کو نرسری کے حوالہ کرکے اپنا وقت سیر سپاٹوں، تفریح گاہوں اور کلبوں میں گزارنا پسند کرتا

ہے۔ یہاں تک کہ وہ خاندانی زندگی گزارنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے مقابلہ میں آزادانہ شہوت رانی کی راہ اختیار کرنے لگا ہے۔ ورنہ آج کے ماحول میں بھی آدمی خاندانی ذمے داریاں ادا کرنا چاہے تو کوئی ایسی حقیقی رکاوٹ نہیں ہے، جس پر قابو نہ پایا جاسکے۔

۵- دورِ جدید میں خاندان منتشر ہو چکا ہے

خاندان کے تصور میں آدمی کی بیوی اور بچوں کے علاوہ اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور دور و نزدیک کے اعزہ و اقارب بھی شامل ہیں اور ان کے حقوق اور ذمے داریاں تسلیم کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان رشتوں اور تعلقات کی قدرو قیمت اس دور میں تھی جب کہ خاندان کے افراد ایک ساتھ رہتے بستے تھے اور مشترک خاندانی نظام قائم تھا، جس میں ایک فرد کا حسن سلوک دوسرا فرد دیکھتا اور اس سے نفسیاتی طور پر متاثر اور اس کے زیرِ بار احسان ہوتا۔ پھر وہ ان احسانات کا بدلہ ادا کرنے کی کوشش کرتا۔ یہیں سے رشتے ناطے وجود میں آئے، ان کی اہمیت تسلیم کی گئی اور ان کے حقوق و فرائض کے ضابطے تیار ہوئے، لیکن موجودہ مشینی دور نے اس کیفیت ہی کو ختم کر دیا ہے۔ آج ایک بچے کا ماں باپ اور اہل خاندان سے وہ تعلق نہیں ہے جو زمانۂ قدیم میں تھا۔ بسا اوقات اسے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں اور کس فرد سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اگر وہ ماں کو جانتا بھی ہو تو اس ماں کا کیا احترام کرے گا جس کی محبت اسے صحیح معنیٰ میں نہ ملی ہو۔ جس بچے کو پیدائش کے بعد نرسری سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور ملازمت یا کاروبار تک کبھی اس کی ماں نے سینہ سے نہیں لگایا، اس کی نگاہ میں اس کی کیا عظمت ہوگی اور اس کے حق کا تصور اس کے ذہن میں کیسے آئے گا؟ اس باپ کو وہ کیوں چاہے گا اور اس کی اطاعت و فرماں برداری کرے گا، جس کی پرورش کا بار اس نے نہ اٹھایا ہو، بلکہ اس کی پرورش ریاست نے کی ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خاندانی نظام اپنے کچھ مقاصد رکھتا ہے۔ اگر ان مقاصد کی اہمیت ہے اور معاشرہ کی بہتر تعمیر و ترقی کے لیے ان کا پورا ہونا ضروری ہے تو خاندان کو نہ صرف یہ کہ باقی رہنا چاہیے، بلکہ اسے مضبوط سے مضبوط تر ہونا چاہیے۔ کوئی ایسا طرزِ حیات، جس سے خاندان کی بنیادیں متزلزل ہوں اور وہ ختم ہوتا چلا جائے، سخت نقصان دہ ہوگا۔ خاندان کو انسان نے اس لیے نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے مقاصد میں ناکام ہے، بلکہ بعض دیگر اسباب کی بنا پر اس نے خاندان سے بغاوت کی اور اس کے تار و پود بکھیر دیے۔ اب خاندان کے ٹوٹنے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے اسے پر کرنے کے لیے وہ دوسرے اداروں کا سہارا لے رہا ہے۔ اس میں وہ ناکام ہے۔

ریاست خاندان کا بدل نہیں ہے

موجودہ دور کے انسان کے نزدیک خاندان کا کم زور یا ختم ہونا کوئی بڑا نقصان نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ریاست اس کا بہتر بدل بن سکتی ہے، حالاں کہ ریاست کے اندر، اس کے وسیع اختیارات کے باوجود خاندان کا متبادل بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

خاندان ایک مختصر سا ادارہ ہے۔ اس کی اپنی ضروریات اور تقاضے ہیں۔ وہ اپنی تربیت و تنظیم کے کچھ اصول رکھتا ہے۔ ان ضروریات کو وہی لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جو اس سے براہِ راست متعلق ہوں اور وہی اس کے جذبات اور نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے اس کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ ریاست کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ زیادہ تر قانون اور طاقت کے بل پر اپنا نظم چلاتی ہے۔ ریاست خاندان کے ساتھ تعاون کرسکتی ہے، لیکن وہ جذبات اپنے اندر نہیں پیدا کرسکتی جو افراد خاندان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔

یہاں ایک اور پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یہ کہ حکومت کا قبضہ یا کنٹرول جس قدر محدود ہوگا افراد کی صلاحیتیں اسی قدر نکھر کر سامنے آئیں گی۔ آدمی

اپنے بل پر تجربات کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ہی عظیم ذمے داریوں کو اٹھانے کا اہل ہوتا ہے۔ اگر خاندان حکومت کے اثر سے آزاد ہو اور اسے صحیح طریقہ سے کام کے مواقع حاصل ہوں تو وہ ایک تربیت گاہ کا بھی کام دے سکتا ہے، جس میں افراد محدود پیمانے پر مختلف ذمے داریاں سنبھالنے اور انھیں بہ حسن وخوبی انجام دینے کی تربیت پاتے ہیں۔ یہ تربیت صحیح ہو تو اجتماعی زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی کار آمد ہوسکتی ہے۔

عرب کا خاندانی اور قبائلی نظام
اور
اسلام کی اصلاحات

قبائلی نظام کے طبقات

اسلام کے آنے سے پہلے اہلِ عرب قبائلی زندگی گزارتے تھے۔ قبیلہ خاندان سے وجود میں آتا ہے۔ اُسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خاندان جب وسعت اختیار کرتا ہے تو قبیلہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اہلِ عرب کے ہاں اس کا ایک نظام تھا۔ اسے انھوں نے اوپر سے نیچے تک چھ درجات میں تقسیم کر رکھا تھا، جنھیں وہ شعب، قبیلہ، عمارہ، بطن، فخذ اور فصیلہ سے تعبیر کرتے تھے۔[1]

'شعب' قبائل کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع شعوب ہے۔ شعب کے لفظی معنی شاخ دار ہونے کے ہیں۔ شعب وہ ہے جہاں سے قبیلے شاخ در شاخ ہوتے ہیں۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں: الشعوب رؤوس القبائل یعنی قبائل کے سرے (جہاں سے قبائل شروع ہوتے ہیں) جیسے ربیعہ، مضر، اوس اور خزرج۔[2]

قبیلہ کے اندر بہت سے خاندان یا 'عمائر' ہوتے ہیں۔ عمارہ بطون پر مشتمل ہوتا

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/ ۳۶۵،۳۶۶ طبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۵ء قرآن مجید میں ان میں سے بعض اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور بعض الفاظ لغوی معنی میں آئے ہیں۔

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۸، جز ۱۶، ص: ۲۲۴ طبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۵ء

ہے۔ بطون جمع ہے بطن کی۔ بطن میں افخاذ ہوتے ہیں۔ اس کا واحد 'فخذ' ہے۔ فخذ کے نیچے فصائل ہوتے ہیں۔ یہ 'فصیلہ' کی جمع ہے۔

حجاز کے عرب حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے تھے۔ اس سے بہت سی شاخیں ہوتی چلی گئیں۔ کئی پشتوں کے بعد خزیمہ بن عامر (مدرکہ) کا خاندان وجود میں آیا۔ خزیمہ کی اولاد میں کنانہ تھا۔ کنانہ کے کئی لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام نضر تھا اور نضر بن کنانہ کو قریش کہا جاتا ہے۔[۱]

اس تقسیم کو سمجھانے کے لیے علامہ زمخشری کہتے ہیں: خزیمہ 'شعب' اور کنانہ اس کا 'قبیلہ' ہے۔ کنانہ سے قریش 'عمارہ' ہے۔ قریش میں قصی 'بطن' ہیں۔ قصی سے ہاشم 'فخذ' اور عباس 'فصیلہ'۔[۲]

کلبی نے ان چھ طبقات میں سے پانچ طبقات کا اسی ترتیب سے ذکر کیا ہے، البتہ آخری طبقہ 'فصیلہ' کا ذکر اس کے ہاں نہیں ہے۔[۳]

بعض اہلِ علم نے 'فصیلہ' کے بعد 'عشیرہ' کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس سے مراد خاندان کے قریب ترین افراد ہیں۔[۴]

---

[۱] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، دارالمعارف، بیروت ۱۹۸۳ء۔ ۱/۸۳، ۸۴ و ما بعد

[۲] زمخشری، الکشاف: ۴/۳۶۲، طبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۵ء۔ بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی تفصیل پیش کی ہے۔ معالم التنزیل و اسرار التاویل: ۲/۴۱۸، طبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۵ء۔

[۳] الشعب اکبر من القبیلۃ، ثم القبیلۃ، ثم العمارۃ، ثم البطن، ثم الفخذ۔ ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت ۱۹۹۴ء، مادہ قبل، ۱۱/۵۴۱

[۴] ابن کثیر کہتے ہیں: قال علماء النسب یقال شعوب، ثم قبائل، ثم عمائر، ثم بطون، ثم افخاذ، ثم فصائل، ثم عشائر۔ والعشیرۃ اقرب الناس الی الرجل ولیس بعدہ شیء۔ السیرۃ النبویۃ: ۱/۶

امام رازیؒ شعب کی جگہ 'قبیلہ' کو اساس قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے تحت شعوب، بطون، افخاذ، فصائل اور اقارب آتے ہیں۔[1]

اس تفصیل سے اتنی بات واضح ہے کہ عرب کا قبائلی نظام مختلف درجات میں تقسیم تو تھا، لیکن ان میں کیا ترتیب تھی اور اس کے لیے کیا اصطلاحات استعمال کی جاتی تھیں، اس میں اہل علم کے درمیان کسی قدر اختلاف ہے۔

معاہدہ کے ذریعہ خاندان میں شمولیت

خاندان کا تعلق اصلاً خونی رشتہ اور حسب نسب سے ہے، لیکن بعض اوقات کوئی نوجوان اپنی شکل وصورت اور وجاہت کی وجہ سے کسی کو پسند آجاتا تو اسے وہ اپنا لیتا اور وہ اسی کی طرف منسوب ہونے لگتا۔[2]

اس مقصد سے ان میں معاہدہ بھی ہوتا، جس کی رو سے وہ ایک دوسرے کی مدد کے پابند اور ایک دوسرے کے وارث قرار پاتے اور انھیں وہی حقوق حاصل ہوتے جو آدمی کے قریب ترین افراد کو حاصل ہوتے ہیں۔ قتادہؒ کہتے ہیں:

کان الرجل فی الجاهلية يعاقد الرجـل فيقول دمی دمک و	زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص دوسرے شخص سے معاہدہ کرتا اور کہتا کہ میرا خون تمھارا خون ہے (کوئی مجھے قتل کردے تو تم قصاص

---

[1] رازی، التفسیر الکبیر، دارالکتب العلمیة، لبنان ۱۹۹۰ء، جلد ۱۴، جزء ۲۸، ص ۱۱۸۔

[2] قرطبی کہتے ہیں: کان الرجل فی الجاهلية اذا اعجبه من الرجل جلده و ظرفه ضمه الی نفسه و جعل لـه نصيب الذكر من اولاده من ميراثه و كان ينسب اليه فيقال فلان بن فلان۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد۷، جزء ۱۴، ص ۸۰ (زمانۂ جاہلیت میں جب کسی کو کسی کی قوت وتوانائی اور سوجھ بوجھ پسند آجاتی تو اسے وہ اپنا لیتا اور وراثت میں اس کا حصہ اپنی نرینہ اولاد کے برابر قرار دے دیتا۔ اس کے بعد اس کی طرف اس کی نسبت ہوجاتی اور کہا جانے لگتا کہ فلاں شخص فلاں کی اولاد ہے)۔

هدمی هدمک و ترثنی وأرثک و تطلب بی و اطلب بک[1]

یا دیت کا اسی طرح مطالبہ کر سکتے ہو، جس طرح اپنے کسی عزیز کے خون کے مطالبہ کا تمھیں حق ہے) جس نے میری عزت پر حملہ کیا گویا اس نے تمھاری عزت پر حملہ کیا (یا جس قاتل کو میں نے معاف کیا تم نے بھی اسے معاف کیا) تم میرے وارث ہوگے اور میں تمھارا وارث ہوں گا۔ مجھ پر زیادتی ہو تو اس کے بدلہ کا تم مطالبہ کروگے اور تم پر زیادتی ہو تو میں اس کے بدلہ کا مطالبہ کروں گا۔

تفسیر کی کتابوں میں اس معاہدہ کا ذکر کسی قدر تفصیل سے ملتا ہے۔[2]

زمخشری کہتے ہیں:

کان الرجل یعاقد الرجل فیقول دمی دمک و هدمی هدمک و ثأری ثأرک، و حربی حربک، و سلمی سلمک و ترثنی وأرثک، و تطلب بی و اطلب

ایک آدمی دوسرے آدمی سے معاہدہ کرتا تو کہتا کہ میرا خون تمھارا خون ہے، میرے خون کا رائیگاں جانا تمھارے خون کا رائیگاں جانا ہے۔ میرا خون کا بدلہ لینا یا انتقام لینا تمھارا بدلہ یا انتقام لینا ہے۔ میری جنگ تمھاری جنگ اور میری صلح تمھاری صلح ہے۔ تم میرے وارث ہوگے اور میں تمھارا وارث ہوں گا۔ مجھ پر زیادتی

---

[1] ابن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن۔ تحقیق محمود محمد شاکر، دارالمعارف مصر ۱۹۷۱ء، ۲۷۵/۸۔ یہی بات عکرمہ نے ان الفاظ میں کہی ہے: کان الرجل یقول للرجل ترثنی وارثک، و تنصرنی وانصرک، و تعقل عنی و اعقل عنک، طبری:۲۷۶/۸

[2] ملاحظہ ہو۔ بغوی، معالم التنزیل۔ نیز خازن، لباب التاویل ۵۹/۲۔ دارالکتب العلمیة، لبنان ۱۹۹۵ء

بــک و تعقل عنی و أعقل عنک[1]

ہوتو تم میرے بدلہ کا مطالبہ کروگے اور تم پر زیادتی ہوتو میں تمھارے بدلہ کا مطالبہ کروں گا۔تم میری طرف سے دیت ادا کروگے اور میں تمھاری طرف سے دیت ادا کروں گا۔

قبیلہ کا حلیف

کبھی یہ بھی ہوتا کہ کوئی شخص کسی قبیلہ میں پہنچ جاتا اور اسے وہ اپنا حلیف قرار دے لیتے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ ان ہی کا ایک فرد ہے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک اور ہم دردی کا رویہ اختیار کیا جاتا، لیکن اس میں بعض اوقات زیادتیاں بھی ہوتی تھیں۔ اپنا حق ہوتا یا کسی سے جنگ کرنی ہوتی تو اس سے فائدہ اٹھاتے، لیکن اگر اس کے حق کی بات ہوتی تو نظر انداز کرنے لگتے۔[2]

تبنیت کا طریقہ

عرب میں متبنیٰ بنانے کا رواج تھا۔اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کسی (نوجوان) کو اپنا بیٹا قرار دے کر اس کا اعلان کر دیتا۔ اب دونوں کا تعلق باپ بیٹا کا ہوجاتا۔ وہ اسی کی طرف منسوب ہوتا۔ اس کی بیوی متبنیٰ کی ماں ہوتی۔اس کی اولاد اس کے بھائی بہن ہوتے۔ ان کے درمیان اس کا خلا ملا اسی طرح ہوتا جس طرح اولاد کا ہوتا۔ وہ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے۔[3]

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۴۹۴۔ یہی الفاظ السیرة الحلبیة، دارالمعارف العلمیة، لبنان۔ ۱/ ۴۴۰ میں بھی موجود ہیں۔ اس طرح کے حلیف کا وراثت میں کتنا حصہ ہوتا ہے اس سلسلے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ بعض روایات سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا حصہ لڑکے کے حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ ایک دوسرا قول ہے کہ وہ چھٹے حصہ کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔ اس موضوع پر راقم نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مضمون میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ [2] طبری، جامع البیان: ۲۸۰/۸
[3] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳/ ۴۶۶، دارالمعرفــة، لبنان، ۱۹۶۹ء

حضرت زید بن حارثہؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ ان کی والدہ سعدیٰ بنت ثعلبہ اپنے قبیلہ بنو معن گئیں۔ ساتھ میں کم سن زید کو لے گئیں۔ اس دوران میں بنو القین کے لوگوں نے اس قبیلہ پر حملہ کر دیا۔ اسی میں حضرت زید کو بھی لے گئے اور بازارِ عکاظ میں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا۔ حکیم بن حزام نے انھیں خرید کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کو دے دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے انھیں رسول اللہ ﷺ کو ہبہ فرما دیا۔ یہ آپ کی خدمت میں تھے کہ ان کے والد اور چچا انھیں لینے کے لیے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ چاہیں تو ان کے ساتھ جاسکتے ہیں اور چاہیں تو آپ کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ حضرت زید نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد آپ نے انھیں آزاد کر کے متبنیٰ بنا لیا۔ حرم میں لے گئے اور لوگوں کے درمیان اعلان فرمایا: **اشهدوا هذا ابنی یرثنی وارثه** (گواہ رہو کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا)۔ اس کے بعد سے آپ کو زید بن محمد کہا جانے لگا۔[1]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

ما کنا ندعو زید بن حارثة الا زید بن محمد[2] — ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد (ﷺ) ہی کہا کرتے تھے۔

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا یہ قول دلیل ہے اس بات کی کہ:

ان التبنّی کان معمولاً به فی الجاهلیة والاسلام یتوارث به و یتناصر الی ان نسخ الله ذٰلک[3] — دور جاہلیت اور اسلام میں متبنی بنانا معمول بہ تھا۔ اس کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کے وارث ہوتے اور باہم نصرت و حمایت ہوتی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ قرار دے دیا۔

---

[1] ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۲/۱۱۵-۱۱۸۔ دار الکتب العلمیة لبنان ۱۹۹۵ء۔ ابن اثیر، اسد الغابہ: ۲/۳۵۱-۳۵۳ طبع دار الکتب العلمیة، لبنان ۱۹۹۶ء

[2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة الاحزاب، باب ادعوهم لآبائهم۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل زید بن حارثة الخ

[3] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد۷، جزء ۱۴، ص ۸۰

خاندان کی عصبیت

خاندان میں دور کے رشتوں کے مقابلے میں قریب کے رشتوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ نیچے کی سطح پر ان میں جو استواری اور استحکام پایا جاتا ہے وہ اوپر کی سطح پر باقی نہیں رہتا۔ دونوں کے درمیان کسی مرحلہ میں تصادم ہوتو آدمی کی ہم دردی قریب کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اہل عرب میں شدید خاندانی اور قبائلی تعصب تھا۔ اس میں قریب کے رشتے کو دور کے رشتوں پر ترجیح حاصل تھی۔ خاندان اور قبیلہ کا مقابلہ ہوتو خاندان کا ساتھ دیا جاتا۔ خاندان کی حمایت کے جذبے نے تعصب کی شکل اختیار کرلی تھی۔ حق و صداقت اور عدل و انصاف کی جگہ خونی رشتوں کو اہمیت حاصل تھی۔ قریب کے افراد کی نصرت وحمایت کو ہر حال میں فرض سمجھا جاتا۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے:

لاَ یسألون اخاهم حین یندبهم　　　فی النائبات علی ما قال برهانا

”مشکلات میں جب ان کا بھائی انھیں آواز دیتا ہے تو اس سے اس کے پکارنے کی وجہ نہیں پوچھتے۔“

دورِ جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ اپنے چچا زاد بھائی سے خطاب کرکے کہتا ہے:

قرّبتُ بالقربیٰ و جدّک اننی　　　متی یک امر للنّکیثة اشهد

”میں نے دوستی کا حق ادا کیا ہے، قسم ہے تیری تقدیر کی جب کوئی پر خطر معاملہ درپیش ہوگا میں ضرور حاضر رہوں گا۔“

و ان ادع للجلّٰی اکن من حماتها　　　و ان یأتک الأعداء بالجهد اجهد

”اور اگر کسی بڑی مصیبت کے وقت مجھے آواز دی گئی تو میں تیری عزت کے حامیوں میں رہوں گا اور اگر دشمن تیرے مقابلہ پر اتر آئیں تو میں پوری قوت سے تیری مدافعت کروں گا۔“

و ان یقذفوا بالقذع عِرضک اسقهم　　　بکأس حیاض الموت قبل التهدّد

”اور اگر انھوں نے تیری عزت پر حملہ کیا تو میں ان کے دھمکی دینے سے قبل ہی انھیں موت کا پیالہ پلادوں گا۔“

قبائل کی جنگیں

قبائلِ عرب کی اصل ایک تھی، لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان جنگ و جدال اور خون ریزی ہوتی رہتی تھی۔ بعض اوقات بہت معمولی باتوں پر تلواریں نکل آتیں اور خون خرابہ کی نوبت آجاتی۔ ان کی ان جنگوں میں فجار کے نام سے چار جنگیں مشہور ہیں:

فجار اول: عکاظ کے میلہ میں بدر بن معشر الغفاری کی خاص مجلس ہوتی تھی۔ وہاں وہ اپنی اونچی حیثیت کا اعلان کرتا اور فخر و مباہات کا اظہار کرتا۔ ایک روز پیر پھیلا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ میں عرب کا سب سے معزز فرد ہوں۔ جو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ باعزت ہے وہ اس پیر پر تلوار ماردے۔ ایک شخص اٹھا اور تلوار چلادی اور پیر کو زخمی کر دیا۔ اس پر دونوں قبیلے لڑ پڑے۔

فجار ثانی: بنو عامر کی ایک عورت بازارِ عکاظ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ قریش کے ایک نوجوان نے اس کے گرد چکر لگانا شروع کردیا اور اس سے چہرہ کھولنے کے لیے کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شریف عورتیں پردہ کیا کرتی تھیں) یہ نوجوان خاموشی سے پیچھے بیٹھ گیا اور اس کے تہہ بند میں ایک کانٹا اس طرح لگا دیا کہ جب وہ اٹھی تو اس کا پچھلا حصہ کھل گیا۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ عورت نے آل عامر کو آواز دی۔ وہ ہتھیار لے کر آگے بڑھے۔ ادھر اس نوجوان نے بنو کنانہ کو طلب کرلیا۔ وہ بھی آگئے اور میدان کارزار گرم ہوگیا۔

فجار ثالث: بنو عامر کے ایک شخص نے بنو کنانہ کے ایک شخص کو قرض دیا تھا۔ وہ اس کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگا تو دونوں قبیلے لڑ پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ عبد اللہ ابن جدعان نے اپنی طرف سے قرض ادا کیا تو یہ جنگ ختم ہوئی۔

فجار رابع: نعمان بن منذر 'ملک حیرہ' اپنا تجارتی قافلہ، جس میں اونٹوں پر

کپڑے اور خوش بو کا سامان ہوتا، بازارِ عکاظ بھیجتا کہ یہ چیزیں یہاں فروخت ہوں اور ان کی قیمت سے طائف کی دباغت شدہ کھالیں خریدی جائیں۔ قافلہ کو وہ کسی عرب سردار کی ذمے داری پر بھیجتا، تاکہ اس کی حفاظت ہو سکے۔ ایک مرتبہ اس نے اس مقصد سے قافلہ بھیجنے کی تیاری کی تو اس کے پاس عرب کے کچھ افراد موجود تھے۔ ان میں بنو کنانہ کا براض اور ہوازِن کا عروۃ الرحال بھی شامل تھے۔ براض نے کہا کہ میں بنو کنانہ کی ذمے داری لیتا ہوں کہ وہ اس سے تعرض نہیں کریں گے۔ نعمان بن منذر نے کہا: میں تو ایسا شخص چاہتا ہوں جو پورے اہل نجد و تہامہ کی طرف سے پناہ دے سکے۔ اس پر عروۃ الرحال نے کہا کہ میں یہ پناہ فراہم کر سکتا ہوں۔ براض نے کہا کہ کیا تم کنانہ کے مقابلہ میں بھی پناہ دو گے؟ عروہ نے کہا: ہاں! کنانہ کیا اہل شیح و قیصوم (عرب کی ساری آبادی) کے مقابلہ میں پناہ دے رہا ہوں۔ اس پر براض سے اس کی تکرار اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ عروہ جب سفر سے واپس ہونے لگا تو براض بھی اس کے پیچھے اس کے قتل کے ارادے سے نکل پڑا۔ ایک جگہ عروہ نے قیام کیا اور دادِ عیش دینے لگا۔ اسے شراب میں مست پا کر براض نے اسے قتل کر دیا۔ اس کی اطلاع ایک شخص نے کنانہ کو اس وقت دی جب وہ عکاظ میں ہوازِن کے ساتھ تھے۔ کنانہ وہاں سے نکل پڑے، تاکہ حدودِ حرم میں پہنچ جائیں، لیکن ہوازن کو بھی یہ خبر مل گئی۔ انھوں نے کنانہ کا تعاقب کیا اور حرم میں پہنچنے سے پہلے ہی انھیں جالیا۔ دونوں قبائل کے درمیان چھ روز تک کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب کنانہ کی طرف سے جنگ میں شریک تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ آپ بیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ جنگ میں جو تیر دشمن کی طرف سے آتے اور زمین پر گر جاتے آپ انھیں اٹھا کر اپنے قبیلے کے جنگ بازوں کو دیتے۔ بالآخر یہ جنگ عتبہ بن ربیعہ کی دعوت صلح پر ختم ہوئی۔ اس میں قبیلہ قیس کے

زیادہ آدمی مارے گئے تھے۔ قریش نے زائد مقتولوں کی دیت ادا کی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دیت نہیں لی۔[1]

حلیف قبائل

قبائل کے درمیان اقتدار کے لیے کشمکش اور طاقت آزمائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ اس کے لیے بعض قبائل مل کر ایک گروہ بن جاتے۔ ان کے مقابلے میں دوسرے قبائل کا گروپ وجود میں آجاتا اور وہ ایک دوسرے کے تعاون کا فیصلہ کرتے۔ انھیں حلیف کہا جاتا۔

'حلف' کے معنی قسم کے ہیں۔ دو فریقوں کا اس بات پر عہد کہ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق ہوگا اور وہ ہر حال میں ایک دوسرے کی نصرت و حمایت کریں گے، اسے بھی حلف کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس عہد و پیمان پر قسم کھائی جاتی تھی۔ معاہدہ کرنے والا ہر فریق دوسرے کا حلیف کہلاتا۔ دور جاہلیت میں خزاعہ نے بنو اسد کو حرم سے نکال باہر کیا تو اس نے قبیلۂ طے سے دوستی اور تعاون کا عہد کیا۔ اس لیے بنو اسد اور طے کو 'حلیفان' (ایک دوسرے کے حلیف) کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد بنو اسد نے بنو فزارہ سے اسی طرح کا عہد کیا تو ان دونوں کو بھی 'حلیفان' کہا جانے لگا۔[2]

قصی بن کلاب نے صحیح معنی میں قریش کو متحد کیا۔ خزاعہ اور بنو بکر وغیرہ قبائل کو مکہ کے اطراف سے نکال باہر کیا اور قریش کو حرم کے چاروں طرف آباد کیا۔ اپنے کارناموں کی وجہ سے وہ بلا شرکت غیرے قریش کے سردار تھے۔ ان کی قیادت کو چیلنج

---

[1] ابن سعد (طبقات: ۱/ ۱۲۶-۱۲۸) طبع دار صادر بیروت اور ابن هشام (السیرة النبویة: ۱/ ۲۲۱-۲۲۴) طبع دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء وغیرہ نے صرف اسی حرب فجار کا ذکر کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی شرکت ہوئی تھی۔ سہیلی اور مسعودی وغیرہ نے ان چاروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس وقت پیش نظر برہان الدین حلبی کی السیرة الحلبیة: ۱/ ۱۲۶-۱۲۸ ہے۔ اس میں ان چاروں لڑائیوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

[2] فیروز آبادی، القاموس المحیط، مادہ حلف۔ ابن منظور، لسان العرب، مادہ حلف

کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مکہ پر ان ہی کی حکم رانی تھی۔ ان کے پاس 'حجابہ'، 'سقایہ'، 'رفادہ'، 'ندوہ' اور 'لواء' کے مناصب تھے۔[1]

قصی بن کلاب کے چار بیٹے تھے: عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ اور عبد (باپ کے نام پر اس کا نام بھی قصی تھا) دو بیٹیاں تخمر اور برّہ تھیں۔ قصی کی حیات ہی میں ان کے بیٹے عبد مناف نے کافی ترقی کی تھی اور لوگوں میں ان کا احترام پایا جاتا تھا۔ عبد العزی اور عبد (قصی بن قصی) کا بھی یہی حال تھا۔ قصی کے بڑے بیٹے عبد الدار کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ قصی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں عبد الدار سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بھی تمھارے بھائیوں کا سا مقام حاصل ہو۔ چناں چہ قصی نے اپنے تمام مناصب عبد الدار کے حوالے کردیے۔ قصی کے فیصلے سے اختلاف کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ سب ہی بھائیوں نے اسے تسلیم کرلیا اور اس پر عمل جاری رہا۔ لیکن بھائیوں کے بعد عبد مناف کی اولاد نے کہا کہ قوم کے اندر ہمیں جو مقام اور حیثیت حاصل ہے اس لحاظ سے ان مناصب کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ عبد الدار کی اولاد نے کہا کہ یہ مناصب لازماً ہمارے پاس ہوں گے۔ قصی کے فیصلے کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ بعض قبائل

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۶۱۔ 'حجابہ' کے معنی ہیں بیت اللہ کی چابیوں پر قبضہ کا ہونا، جس کا اس پر قبضہ ہوتا وہ جس کے لیے چاہتا کعبہ کا دروازہ کھولتا اور جس کے لیے بند کرنا چاہتا بند کر دیتا۔ 'سقایہ' یعنی زمزم کا پانی پلانا۔ حاجیوں کی خدمت بہت بڑی سعادت سمجھی جاتی تھی، چناں چہ حج کے ایام میں زمزم خالص شکل میں یا اس میں شہد، دودھ یا نبیذ ملاکر حاجیوں کو پلانا ایک اہم دینی منصب تھا۔ 'رفادہ' یعنی مہمان نوازی۔ حج کے زمانہ میں حاجیوں کے کھانے کا نظم کرنا بھی ایک دینی ذمے داری سمجھی جاتی تھی۔ اس کے لیے قریش اپنے اموال سے ایک متعین مقدار قصی کے پاس جمع کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ 'ندوہ' سے مراد رائے اور مشورہ کے لیے جمع ہونا۔ قصی نے دارالندوہ قائم کیا تھا۔ تمام اہم امور وہیں طے ہوتے تھے۔ 'لواء' علم یا جھنڈے کو کہا جاتا ہے۔ جنگ میں علم بردار وہی ہوتا جسے سردار منتخب کرتا۔ یہ تمام مناصب قصی کو حاصل تھے۔

نے بنوعبد مناف کا ساتھ دیا اور بعض نے بنوعبد الدار کا۔ بعض قبائل نے اس تنازعہ سے الگ رہنا پسند کیا۔

بنوعبد مناف نے ایک بڑے برتن میں خوش بو بھری اور کعبہ کے پاس رکھ دیا۔ وہ اور ان کے حلیف اس میں ہاتھ ڈال کر آپس میں تعاون اور ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور کبھی ساتھ نہ چھوڑنے کا عہد کرتے اور کعبہ پر اپنا ہاتھ پھیرتے۔ یہ عہد کو پختہ کرنے کی صورت تھی۔ ان قبائل کو 'مطیّبین' کہا گیا، یعنی جنھوں نے خوش بو کا استعمال کیا۔ دوسری طرف بنوعبد الدار اور ان کے حلیفوں نے بھی کعبہ کے پاس عہد کیا کہ وہ ہر حال میں ایک دوسرے کا تعاون کریں گے اور حلیفوں کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ انھیں 'احلاف' کہا جانے لگا۔

دونوں فریقوں نے جنگ کی تیاری شروع کردی، لیکن جلد ہی انھیں احساس ہوا کہ وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو ختم کردیں گے۔ اس پر ان کے درمیان صلح ہوگئی کہ بنوعبد مناف کو سقایہ اور رِفادہ کے مناصب حاصل ہوں گے اور بنوعبد الدار حسب سابق حجابہ، ندوہ اور لواء کے مناصب اپنے پاس رکھیں گے۔[1]

سیرت کا یہ ایک اہم اور نمایاں واقعہ ہے کہ اہلِ مکہ نے جب دیکھا کہ رسول اللہؐ کے صحابہ کو حبشہ میں پناہ مل رہی ہے، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے باہمت اور حوصلہ مند افراد آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کا ساتھ دے رہے ہیں (اور آپ کے چچا ابو طالب آپ کی حمایت سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں) تو قریش کے قبائل بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف باقاعدہ محاذ آرا ہوگئے اور ان کے سماجی مقاطعہ کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے ایک تحریر تیار کی کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب سے شادی بیاہ

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۵۹-۱۶۹، ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۶۶-۷۳، طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۰۵-۵۰۹، دارالکتب العلمیۃ لبنان ۱۹۹۷ء۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن کثیر السیرۃ النبویۃ: ۱/۹۴-۱۰۲ دار المعرفۃ، بیروت، لبنان ۱۹۸۳ء

ور خرید و فروخت کا تعلق نہیں رکھا جائے گا اور ان سے میل جول اور سماجی تعلقات ختم
کردیے جائیں گے۔ اس تحریر کو کعبہ کے وسط میں لٹکا دیا گیا تاکہ اس کا احترام ہو اور
س کی پوری پابندی کی جائے۔[۱]

یہ مقاطعہ دو تین سال جاری رہا۔ بعد میں ان ہی میں سے بعض افراد کی کوشش
سے یہ غلط اور مبنی بر ظلم معاہدہ ختم ہوا۔[۲]

علف الفضول

کبھی اعلیٰ مقاصد کے لیے بھی قبائل اور ان کی مختلف شاخوں کے درمیان
عاہدہ ہوتا تھا۔ اس کی بہترین مثال حلف الفضول ہے۔

حرب فجار کے چار ماہ بعد زبیر بن عبد المطلب کی تحریک پر بنو ہاشم،
و عبد المطلب، بنو زہرہ بن کلاب، بنو اسد بن عبد العزیٰ اور بنو تیم بن مرہ، عبد اللہ بن
دعان کے مکان پر جمع ہوئے اور قسم کھا کر عہد کیا کہ ظالم کوئی بھی ہو ہم سب اس کے
لاف کھڑے ہوں گے اور ایک ہو کر مظلوم کا ساتھ دیں گے، چاہے وہ مکہ کا ہو یا مکہ
سے باہر کا، یہاں تک کہ اس کا حق اسے مل جائے۔ اس پر ہم سب عمل کرتے رہیں گے
ب تک سمندر اپنے جھاگ کو تر رکھے اور ثبیر اور حرا کی پہاڑیاں اپنی جگہ جمی رہیں
یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) اور ہم ایک دوسرے کی مالی مدد اور غم خواری کریں
گے۔ رسول اللہ ﷺ اس میں شریک تھے۔ بعثت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس پاکیزہ
ہد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لقد شهدت فی دار عبد اللّٰه بن	میں عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں ایک
جدعان حلفا ما احب ان لی به	ایسے معاہدہ میں موجود تھا کہ اس کے

۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۸۸۔

۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۰۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۰۸-۲۱۰

حمر النعم ولو ادعی بہ فی الاسلام لاجبت.[1]	مقابلے میں سرخ اونٹ بھی میں پسند نہیں کروں گا۔ اگر اسلام میں بھی اس کی دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔

اسلام کی اصلاحات

عرب کے خاندانی اور قبائلی نظام کی یہ ایک بہت ہی مختصر اور اجمالی سی تصویر ہے۔ اس میں بعض خوبیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن اس میں خوبیوں سے زیادہ خامیاں اور خرابیاں در آئی تھیں۔ اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس قبائلی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور اسے صحیح رُخ عطا کیا۔

ازدواجی تعلق اور خونی رشتے خاندان کی اساس ہیں

اسلام نے خاندان کی بنیاد جائز ازدواجی تعلق اور خونی رشتوں پر رکھی۔ اس نے کہا کہ اس کے بغیر کوئی شخص خاندان کا فرد شمار نہیں ہوگا اور اسے خاندان کے حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔

مواخات کے حدود

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔ اس کی بنیاد پر مہاجرین کے ساتھ غیر معمولی ایثار اور حسن سلوک ہی کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ انصار کے اموال میں ان کا قانونی حق بھی تسلیم کیا گیا اور وہ ان کے وارث قرار دیے گئے۔ یہ ایک پہلو سے خاندان میں باہر کے افراد کی شمولیت تھی اور

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۶۹-۱۷۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۱۲۸، ۱۲۹۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۵۷-۲۶۲۔ حلف الفضول کا مختصر سا ذکر راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' میں بھی موجود ہے۔ حلف الفضول پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا مقالہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اپریل-جون ۲۰۰۲ء

اس سے خاندان کے حقوق متاثر ہو رہے تھے، اس لیے اس کی قانونی حیثیت ختم کردی گئی۔ چناں چہ ارشاد ہے:

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ (الانفال:۷۵)

اور رشتہ دار، اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کی میراث کے (دوسروں کے مقابلہ میں) زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں ہوئی:

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○ (الاحزاب:٦)

اور رشتہ دار، اللہ تعالیٰ کے قانون میں، دوسرے ایمان والوں اور مہاجرین سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ ہاں اگر تم اپنے رفیقوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہو (تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے) یہ اللہ کی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

متبنّیٰ نہیں بنایا جاسکتا

اسی اصول کے تحت تبنّیت کے رواج کو ختم کیا گیا۔ اس بات کی قانونی طور پر ممانعت کردی گئی کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بچہ کو متبنّیٰ بنا کر اسے اپنی اولاد کے حقوق عطا کردے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں کہا:

وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَ كُمْ اَبْنَآءَ كُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ○ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ

اللہ نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارے (حقیقی) بیٹے نہیں بنا دیے ہیں۔ یہ تو محض تمھارے منہ سے نکلی ہوئی بات ہے۔ اللہ حق کہتا ہے اور وہی سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ انھیں ان کے باپوں کی

اللّٰہِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَ ھُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ مَوَالِیۡکُمۡ ؕ وَ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ فِیۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِہٖ ۙ وَ لٰکِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ○ (الاحزاب: ۴،۵)

طرف منسوب کرکے پکارو۔ اللہ کے نزدیک یہی صحیح طریقہ ہے۔ اگر تمھیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔ تم سے (اس معاملہ میں) جو چوک ہوجائے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ ہاں جو بات تمھارے دل کے قصد و ارادے سے نکلے (اس کی باز پرس ہوگی) اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

یہ اس امر کی صراحت ہے کہ متبنّٰی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ وہ اپنے حقیقی باپ کی طرف منسوب ہوگا۔ جس کا نسب ہی معلوم نہ ہو وہ دینی بھائی اور رفیق تصور کیا جائے گا اور اس کے ساتھ حسن سلوک ہوگا۔ اس طرح یہ اصول طے پایا کہ جو کسی کی صلبی اولاد نہیں ہے اسے کسی صورت میں اولاد کے حقوق حاصل نہ ہوں گے۔

قبائل کا اتحاد

قبائلِ عرب ایک دوسرے کے حریف بن گئے تھے۔ ان کے درمیان عداوتیں اور دشمنیاں پرورش پا رہی تھیں۔ معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نکل آتیں اور خون ریزی شروع ہوجاتی۔ اسلام نے ان حریف اور متحارب قبائل میں اخوت ومحبت کے جذبات پیدا کیے اور ان سب کو جوڑ کر ایک ملت بنایا اور وہ اپنے اختلافات اور تعصّبات کو بھول کر باہم شیر وشکر ہوگئے۔ اسی احسانِ عظیم کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَ کُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡھَا ؕ (آل عمران: ۱۰۳)

تم اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تمھارے دلوں کو محبت سے جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے، اللہ نے تمھیں اس سے بچالیا۔

اس کا اطلاق عرب کے تمام ہی قبائل پر ہوتا ہے، لیکن اصلاً اس میں مدینہ کے اوس اور خزرج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کے درمیان بار بار جنگ کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔ جنگ بعاث، جنگ داحس اور جنگ حاطب جیسی جنگیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ہجرت سے پہلے حج کے موسم میں رسول اللہ ﷺ جس طرح دوسرے قبائل کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرماتے اسی طرح عقبہ کے مقام پر خزرج کے وفد کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے اسے قبول کرتے ہوئے کہا کہ ہماری قوم کے درمیان جو عداوت اور دشمنی ہے وہ کسی دوسری قوم میں نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے ہمارے درمیان شاید اتحاد پیدا فرما دے۔ ہم اس کے سامنے آپ کا پیغام رکھیں گے اور جس دین کو ہم نے قبول کیا ہے اسے قبول کرنے کی دعوت دیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس پر ہم سب کو متحد و متفق کردے تو ہمارے درمیان آپ سے زیادہ محترم و معزز کوئی دوسرا شخص نہ ہوگا۔[1]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اوس اور خزرج کے قبائل کا کیا حال تھا۔ زمخشری اور بعض دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ اوس وخزرج ایک ماں باپ کی نسل سے تھے، لیکن ان کے درمیان عداوت اور دشمنی کا سلسلہ ایک سو بیس (۱۲۰) برس سے جاری تھا۔ بالآخر اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور رسولِ خدا ﷺ کے ذریعے ان کے درمیان الفت و محبت پیدا فرمائی۔[2]

عالم گیر امت وجود میں آگئی

قبائلی نظام ایک تنگ دائرہ میں محدود تھا۔ وہ اسی دائرہ میں اپنے معاملات و مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سے باہر کی دنیا کو وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اسلام نے اسے فکر و نظر کی اس تنگ نائے سے نکالا اور اسے انسانیت کا وسیع تصور دیا۔ اس نے

---

[1] ابن هشام، السيرة النبوية: ۲/ ۴۲
[2] زمخشري، الكشاف عن حقائق التنزيل: ۱/۳۸۷

بتایا کہ پوری دنیا کے انسان ملکوں، خطوں، نسلوں، زبانوں اور رنگ روپ کے اختلاف کے باوجود ایک ہیں، اس لیے کہ ان کی اصل ایک ہے، وہ سب ایک اللہ کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ خاندان اور قبیلے محض تعارف کا ذریعہ ہیں، ان کی بنیاد پر نوعِ انسانی کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ○
(الحجرات:۱۳)

اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں کر دیا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں زیادہ باعزت اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوے والا ہے۔ یقیناً اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔

جب سارے انسان ایک ہی ہیں تو ان کی صلاح و فلاح کا راستہ بھی ایک ہی ہوسکتا ہے۔ وہ راستہ ہے خدا کی عبادت و اطاعت اور اس کی بندگی کا۔ اسی راستہ کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ○ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○
(البقرۃ:۲۱،۲۲)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا، تاکہ تم تقویٰ کی زندگی گزار سکو۔ (تمھارا رب) جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس سے تمھارے کھانے کے لیے پھل پیدا کیے۔ پس کسی کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھہراؤ جب کہ تم جانتے ہو (کہ کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں ہے)۔

اس طرح اسلام نے ان قبائل کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کیا جو باہم جنگ و جدال اور کشت وخون میں گرفتار تھے۔ ان کے اختلاف و انتشار کو رفع کرکے انھیں ایک وحدت میں تبدیل کیا اور ایک امت بنایا۔ جو قبائل بہت ہی محدود دائرہ میں سوچنے اور صرف اپنے مفاد کو دیکھنے کے عادی تھے انھیں ایک آفاقی اور عالمی نقطۂ نظر عطا کیا اور انھیں ساری دنیا کے امام اور رہنما کی حیثیت سے کھڑا کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ صالح انقلاب برپا ہوا، جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔

اسلامی خاندان
کے
خدوخال

☆ اسلامی خاندان

☆ صحیح جنسی رویہ

☆ ازدواجی تعلقات

☆ اہلِ خاندان کے حقوق و فرائض

اسلامی خاندان

اللہ تعالیٰ کے رسول اس کے برگزیدہ اور مقرب ترین بندے ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی تقویٰ اور خدا ترسی میں دنیا کے لیے نمونہ ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ انھوں نے خاندانی اور عائلی زندگی گزاری اور اس کے تقاضے پورے کیے۔ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَ جَعَلْنَا لَھُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّۃً ؕ (الرعد:۳۸)	ہم نے آپ سے پہلے کتنے ہی رسول بھیجے اور انھیں بیویاں اور اولاد دی تھی۔

قرآن مجید نے متعدد پیغمبروں کی بیویوں کا، ان کی ذریت اور خاندان کے دوسرے افراد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ان پیغمبروں کے اپنے اہل خاندان سے تعلقات، ان کی محبت، ہم دردی، اخلاص اور خیر خواہی اور اہل خاندان کا ان کے ساتھ رویہ اور ان کی حمایت و مخالفت کی تفصیل نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے اللہ کے آخری رسول ﷺ اور آپؐ کی ازواج و اولاد کا ذکر بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے کیوں خاندانی زندگی گزاری اور اس کے مسائل اور الجھنوں سے کنارہ کش رہ کر اللہ کی عبادت میں کیوں نہیں لگ گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خاندانی زندگی سے دین و اخلاق کو جو رفعت ملتی ہے اور ہم دردی، تعاون اور خیر خواہی کے جو پاکیزہ جذبات نشو ونما پاتے ہیں اور ضبطِ نفس اور اصلاح و تربیت کے جو مواقع میسر آتے ہیں وہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہوتے۔

خاندان کی دینی حیثیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ خاندان صرف سماجی اور معاشرتی ادارہ ہی نہیں ہے بلکہ اسے دینی اور اخلاقی حیثیت بھی حاصل ہے۔ جو شخص عائلی زندگی گزارتا ہے وہ درحقیقت پیغمبروں کے اسوہ پر عمل کرتا اور اپنی سیرت و اخلاق کو اس ذریعے سے بلند کرتا ہے۔

نظام خاندان کی بنیادیں

اسلام نے اجتماعی زندگی میں خاندان کو بنیادی اہمیت دی ہے اور جس قسم کے خاندان کی تشکیل وہ چاہتا ہے اس کے خدوخال واضح کیے ہیں۔ اس نے جنسی تعلق، ازدواجی زندگی، اس کی ذمے داری، اس کے مسائل، اہل خاندان سے تعلقات، ان کے حقوق و فرائض اور ان سے متعلق دیگر معاملات کے سلسلے میں تفصیلی ہدایات دی ہیں اور اپنے ماننے والوں کو ان کا پابند بنایا ہے۔

نظام خاندان میں تین امور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

۱- جنسی رویہ: خاندان کی اساس جنسی روابط پر ہے۔ اس کے بارے میں انسان جو رویہ اختیار کرے گا اسی نوعیت کا خاندان وجود میں آئے گا۔

۲- ازدواجی تعلقات: میاں بیوی کے تعلقات عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہوں اور ان کے درمیان اخلاص و محبت اور حسن سلوک کی فضا پائی جائے تو ان کی زندگی خوش گوار ہوگی۔ لیکن اگر یہ تعلقات کشمکش اور ظلم و زیادتی کا شکار ہوں تو دونوں کی زندگی خاندانی سکون سے محروم ہوگی۔ اس کے ساتھ ان تعلقات کے اچھے یا برے اثرات پورے نظام خاندان پر پڑیں گے۔

۳- رشتہ داروں کے حقوق اور فرائض: خاندان صرف میاں بیوی اور بچوں کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہے اور اس کے اخلاقی اور قانونی تقاضے ہیں۔ ان کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ خاندان اپنی معنویت کھودے گا۔

آئندہ صفحات میں ان تینوں امور کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

صحیح جنسی رویہ

خاندان صرف مردوں یا صرف عورتوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی تعمیر و تشکیل میں مرد اور عورت دونوں کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر کسی سوسائٹی میں کچھ مرد یا کچھ عورتیں باہم مل جل کر زندگی گزارنے لگیں اور غیر فطری طریقے سے اپنی خواہشات پوری کرنے لگیں تو اسے خاندان نہیں کہا جائے گا۔ اس وقت مغرب میں ہم جنسیت (Homo Sexuality) کا جو رجحان فروغ پا رہا ہے وہ نظام خاندان کی ابتری اور تباہی کا شدید ردعمل ہے۔ اس میں ایک مرد دوسرے مرد کے ساتھ اور ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ یہی ان کا گھر اور خاندان ہوتا ہے اور اس میں ایک دوسرے کے حقوق بھی متعین کر لیے گئے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ اس ہم جنسی سے مختلف نوع کے امراض پھیل رہے ہیں، یہ طرزِ حیات خاندان کے مقاصد کی تکمیل ہرگز نہیں کرتا۔

جنسی تعلق کی اہمیت

خاندان کا آغاز مرد اور عورت کے جنسی تعلق سے ہوتا ہے، اس لیے خاندان کی تشکیل میں اس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس تعلق کے بارے میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر رہبانیت کا ہے اور دوسرا اباحیت کا۔ یہ دونوں ہی نقطۂ نظر غیر فطری اور اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں۔

رہبانیت جنسی تعلق کی مخالف

رہبانیت جنسی جذبات کو دبانے اور کچلنے کی تعلیم دیتی ہے اور اسے روحانی ترقی کا ذریعہ تصور کرتی ہے، لیکن یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس پر ہزاروں اور لاکھوں افراد میں شاید دو ایک ہی بہ مشکل تمام عمل کرسکتے ہیں۔ انسان کے اندر جنسی جذبات اتنی شدت کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ وہ اس طرح کی بندش قبول نہیں کرسکتا۔ اس کے سامنے اس جذبے کی تسکین کی صحیح اور جائز راہیں بند ہوں تو وہ غلط راستوں پر چل پڑے گا۔ رہبانیت درحقیقت انسان کے فطری تقاضوں سے فرار کی ایک صورت ہے، جسے مذہب کا نام دے دیا گیا ہے۔ اس پر کسی معاشرے کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔

اباحیت اور اس کے نقصانات

دوسرا نظریہ اباحیت کا ہے۔ یہ جنسی تسکین کے لیے پوری آزادی چاہتا ہے اور کسی قید و بند کا قائل نہیں ہے۔ یہ رویہ فرد اور سماج دونوں کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اس سے انسان کی جسمانی اور دماغی قوتیں بری طرح متاثر ہوتی ہیں اور وہ مختلف امراض کا شکار ہونے اور ہلاکت کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہ معاشرے کو جنسی انتشار اور آوارگی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس میں آدمی جنسی لذت تو حاصل کرتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں ہونے والی اولاد کو عورت کے سر ڈال کر الگ ہوجاتا ہے، یا دونوں ہی اس سے دامن کش ہوکر بچے کو کسی فلاحی ادارے یا ریاست کے حوالے کردیتے ہیں۔ یہ ادارے بچے کی مادی ضروریات کو تو کسی حد تک پوری کرسکتے ہیں لیکن اس محبت سے خالی ہوتے ہیں جو ماں باپ کے سینوں میں موج زن ہوتی اور اولاد میں منتقل ہوتی ہے۔ اولاد کی ذمے داری سے بچنے کے لیے مغرب میں Childless Family کا رجحان عام ہوتا جارہا ہے۔ اس کے دو نقصانات بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے اندر ذمے داریوں

سے گریز اور ذاتی لذت کے حصول کا مزاج پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی بھی سماجی اور معاشرتی ذمے داری کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر اولاد کے بغیر زندگی گزارنے کا رجحان عام ہوتو آبادی میں لازماً کمی واقع ہوگی، معاشرہ افرادی قوت سے محروم ہوتا چلا جائے گا اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اسے باہر کے افراد کی مدد لینی پڑے گی۔

نکاح، جنسی تسکین کا جائز طریقہ

اسلام رہبانیت اور اباحیت دونوں کے خلاف ہے۔ جنسی جذبہ اس کے نزدیک ایک فطری جذبہ ہے اور اس کی تسکین غلط نہیں ہے، البتہ اس کا اصرار ہے کہ یہ جائز طریقے سے ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنا ممنوع اور حرام ہے۔ اسے وہ زنا قرار دیتا ہے اور اس کی سخت سزا تجویز کرتا ہے۔ وہ سماج کو زنا اور اس کی ترغیبات سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اہل ایمان کی ایک خصوصیت یہ بیان کرتا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۝

(المومنون: ۵-۷)

وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ البتہ اپنی بیویوں اور ان عورتوں سے جو ان کی ملکیت میں ہیں، یعنی باندیوں سے (اپنی خواہش پوری کرتے ہیں)، جو لوگ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ تلاش کریں تو یہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

ان آیات میں جنسی تسکین کے دو جائز طریقے بیان ہوئے ہیں۔ وہ ہیں ازواج یا باندیوں کے ذریعے جنسی تسکین حاصل کرنا۔ موجودہ دور میں عملاً باندیوں کا وجود نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص باندی رکھنا چاہے تو بھی نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے اب ازواج ہی سے تعلق ایک جائز صورت رہ گئی ہے۔

نکاح عورت کو زوجیت میں لانے کا جائز طریقہ ہے۔ نکاح ایک عہد و پیمان ہے جو مرد اور عورت کی آزاد مرضی سے وجود میں آتا ہے۔ اس میں کسی کے ساتھ جبر اور زیادتی کا عنصر نہیں ہوتا۔ مرد خود سے اس کا فیصلہ کرتا ہے اور عورت کی اجازت بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ اگر کسی ناسمجھ یا نابالغ لڑکی کا نکاح ہوجائے تو بلوغ کے بعد وہ اپنی رائے اور اختیار کا استعمال کرسکتی ہے۔

نکاح کی قانونی حیثیت

نکاح کو بعض فقہاء نے سنت کہا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ مستحب اور پسندیدہ ہے، بعض اسے سنت مؤکدہ اور واجب کہتے ہیں، لیکن اگر آدمی ایسے حالات میں گھر جائے کہ زنا اور بدکاری میں مبتلا ہونے کا شدید خطرہ ہو اور وہ معاشی لحاظ سے ازدواجی ذمے داریاں برداشت کرسکتا ہو تو نکاح اس کے لیے واجب قرار پائے گا۔

معاشرہ نکاح میں مدد کرے

معاشرے کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ بے شادی شدہ افراد کی شادی کا اہتمام کرے اور اس معاملے میں ان کے ساتھ تعاون کرے، تاکہ کوئی شخص محض وسائل کے فقدان کی وجہ سے تجرد کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوجائے۔ ارشاد ہے:

وَ اَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَالصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَ اِمَآئِكُمۡ ؕ اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ○ (النور: ۳۲)

اور نکاح کردو اپنے میں سے ان کا جو بے شادی شدہ ہیں، اسی طرح اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے ان کا جو نیک اور صالح ہیں (اور حقوق ادا کرسکتے ہیں) اگر وہ نادار ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انھیں غنی بنادے گا۔ اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔

خفیہ جنسی تعلق کی ممانعت

اسلام اس بات کو ناجائز قرار دیتا ہے کہ کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان خفیہ طور پر جنسی تعلق قائم ہوجائے، ان کے اندر احساس جرم پرورش پاتا رہے اور وہ اپنی ذمے داریوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ جو عورتیں آدمی کے لیے محرمات ہیں، جن سے اس کا نکاح نہیں ہوسکتا، ان کے ذکر کے بعد فرمایا:

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ط (النسآء: ۲۴)

اور حلال کردی گئی ہیں تمھارے لیے ان کے سوا دوسری عورتیں، اس طرح کہ تم ان کو مال (مہر) کے ذریعہ طلب کرو، قید نکاح میں لانے کے لیے، نہ کہ بدکاری کے لیے۔

نکاح کا اعلان

اسلام یہ چاہتا ہے کہ نکاح کا اعلان اور اظہار ہو، تاکہ معاشرہ اس بات سے واقف ہو کہ فلاں مرد اور عورت کے درمیان ازدواجی رشتہ قائم ہوگیا ہے، وہ ایک دوسرے کے شریکِ حیات ہیں اور اس کی اخلاقی اور قانونی ذمے داریاں اٹھانے کا عہد کرچکے ہیں تاکہ وقت ضرورت معاشرہ خود بھی ان ذمے داریوں کے ادا کرنے میں ان کی مدد کرسکے اور اس معاملے میں ان سے غفلت ہو تو گرفت کرسکے۔ اسی لیے نکاح کے ثبوت کے لیے کم ازکم دو گواہوں کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے، اس کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاَ نکاح الّا بولی و شاھدی عدل وما کان من غیر ذٰلک فھو باطل فان تشاجروا فالسلطان ولی من لاَ ولی له.[1]

نکاح ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نہ ہوگا۔ جو نکاح اس سے ہٹ کر ہو وہ باطل ہے۔ اگر آپس میں اختلاف ہو تو جس کا کوئی ولی نہیں سلطان (مسلمان حاکم) اس کا ولی ہوگا۔

---

[1] ھدایہ، کتاب النکاح مع زیلعی بحوالہ ابن حبان، ۲۱۲/۳۔ ولی کی حیثیت پر تفصیل آگے ایک سوال کے جواب میں آرہی ہے۔

صرف جائز اولاد کے حقوق ہیں

انسان کے اندر اولاد کی فطری خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ اس سے جذباتی تعلق رکھتا ہے، اس سے شدید محبت کرتا، اس سے راحت اور سکون محسوس کرتا اور اس پر اپنا مال و متاع اور اپنی دولت صرف کر کے مسرت کا احساس کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ذریعے اس کا نام باقی اور اس کی نسل جاری رہے۔ وہ اسے اپنے مال و دولت، جائداد اور اسباب و وسائل کا جائز وارث تصور کرتا ہے۔ اسلام اس جذبہ کو غلط نہیں سمجھتا۔ اس نے اسے باقی رکھا ہے اور اولاد کی ترغیب دی ہے:

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ص (البقرة:۱۸۷)

(ازدواجی تعلق کے ذریعے) اللہ نے جو اولاد تمھارے حصہ میں رکھ دی ہے وہ طلب کرو۔

نکاح کے ذریعے جو اولاد ہوگی وہی جائز اولاد ہوگی اور اسی کو قانونی حقوق حاصل ہوں گے۔ ناجائز جنسی تعلق کے نتیجے میں جو بچہ پیدا ہوگا اس کا کوئی قانونی حق نہ ہوگا۔ خود اس بچہ پر اس شخص کا کوئی حق نہیں تسلیم کیا جائے گا جس کے نطفہ سے وہ پیدا ہوا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کا وارث نہیں ہوگا۔

اولاد کے قانونی اور اخلاقی حقوق ہیں۔ ان حقوق کا ادا کرنا والدین کے لیے لازمی ہے۔ ان کو معاشی یا سماجی بوجھ سمجھ کر ختم نہیں کیا جاسکتا، ان کی غذا، لباس اور دوسری ضروریات پوری کی جائیں گی، ان کو بہتر تعلیم و تربیت دی جائے گی اور ان سے محبت اور پیار کا سلوک ہوگا، لین دین میں ان کے درمیان امتیاز نہیں برتا جائے گا، لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ یکساں رویہ اختیار کیا جائے گا۔

قریبی رشتوں کا تقدس

جنسی آوارگی بڑھتی ہے تو خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں رہتا۔ آج دنیا کھلی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ اسلام نے خاندان کے قریب ترین افراد کے درمیان جنسی تعلق کو ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیا ہے۔ انھیں 'محرمات ابدیہ' کہا جاتا ہے۔

ان سے انسان کا کسی حال میں ازدواجی رشتہ قائم نہیں ہوسکتا، تاکہ اس دائرہ میں جنسی جذبات پرورش نہ پائیں اور خاندان میں تقدس اور احترام کی فضا پائی جائے۔ بعض محرمات غیر ابدی بھی ہیں، جن سے ازدواجی رشتہ خاص حالات میں حرام ہوتا ہے۔

عرب میں خاندان کا تقدس اور پاکیزگی پامال ہو رہی تھی۔ بعض اوقات لوگ سوتیلی ماں سے شادی کر لیتے۔ قرآن نے اسے بڑی بے حیائی اور بے راہ روی قرار دیا:

وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقۡتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا ۝ (النسآء:۲۲)

تمھارے باپ (دادا نانا) نے جن عورتوں سے نکاح کیا ہے ان سے تم نکاح نہ کرو۔ ہاں اس سے پہلے جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ بے شک یہ بے حیائی کی حرکت اور (خدا کے) غضب کا کام اور برا طریقہ ہے۔

ایک غلط طریقہ یہ رائج تھا کہ آدمی دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کر لیتا۔ یہ بھی ہوتا کہ بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح کر لیا جاتا۔ یہ ایک غیر فطری عمل تھا۔ قرآن نے اسے حرام قرار دیا:

وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۝ (النسآء:۲۳)

(اللہ نے حرام کیا ہے) کہ تم دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرلو۔ ہاں جو ماضی میں ہوچکا، ہوچکا۔ بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

اس میں حقیقی، سوتیلی اور رضاعی بہنیں شامل ہیں۔ احادیث میں بیوی کے ساتھ اس کی خالہ یا پھوپھی سے نکاح کو بھی منع کیا گیا ہے۔

قرآن نے ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی، بھتیجی، رضاعی ماں، رضاعی بہن، بیوی کی ماں (خوش دامن)، ربیبہ (بیوی کی وہ لڑکی جو دوسرے شوہر سے ہو)، لڑکے کی بیوی (بہو) سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ (النساء:۲۳)

اس طرح اسلام نے قریب ترین رشتوں کے احترام کا جذبہ پیدا کیا اور اس احترام کو ختم کرنے کی کسی حال میں اجازت نہیں دی، تاکہ خاندان جنسی جذبات کی آماج گاہ نہ بننے پائے۔

ازدواجی تعلقات

ازدواجی تعلق محبت کا تعلق ہے

ازدواجی رشتہ حقیقت میں الفت و محبت کا رشتہ ہے۔ اسے اسی حیثیت سے دیکھنا اور برقرار رکھنا چاہیے۔ مرد، عورت کو اپنا ہی ایک جز سمجھے اور عورت اس کے لیے وجہِ سکون ثابت ہو۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ سوچنے سمجھنے والے اس رشتۂ محبت میں قدرت کی بڑی نشانیاں دیکھ سکتے ہیں:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ○

(الروم:۲۱)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم ان کے ذریعے سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔

شوہر اور بیوی کے حقوق اور ذمے داریاں

ازدواجی تعلق محض جنسی تسکین کا ذریعہ ہی نہیں، بلکہ اس سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کے حقوق ہیں جو انھیں حاصل ہوں گے اور

دونوں کی ذمے داریاں بھی ہیں جن کے وہ پابند ہوں گے۔ قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ کہا ہے:

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرة: ۲۲۸)

اور عورتوں کا حق ہے (مردوں پر) جیسا کہ (مردوں کا) ان پر حق ہے۔ دستور کے مطابق۔

احکامِ طلاق کے ذیل میں ارشاد ہے:

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ (البقرة: ۲۳۳)

نہ تو ماں کو نقصان پہنچایا جائے اس کے بچے کے ذریعے (یعنی بچہ کو ماں سے جدا کرکے) اور نہ اسے نقصان پہنچایا جائے جس کا وہ بچہ ہے (یعنی باپ کو)۔

مرد کی ذمے داری ہے کہ وہ معاشی تگ و دو کرے، بیوی کا نان ونفقہ برداشت کرے، گھر اور اس کا ضروری ساز و سامان فراہم کرے۔ عورت گھر کا نظم و نسق سنبھالے، اسے ایک بہتر اور سلیقے کا گھر بنائے، اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے، بچوں کی نگہ داشت اور انھیں بہترین تربیت وتہذیب سے آراستہ کرے۔ رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے:

الرجل راع علی اهل بیته وهو مسئول عن رعیته، والمرأة راعیة علٰی اهل بیت زوجها و ولده وهی مسئولة عنهم.[1]

آدمی اپنے گھر والوں کا راعی (نگراں) ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں (قیامت کے روز) پوچھا جائے گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی راعیہ (نگراں) ہے اور اس سے ان کے متعلق (قیامت کے روز) سوال ہوگا۔

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام

عورت کی ظلم سے حفاظت

عورت صنف نازک ہے۔ اس کے تسلیم شدہ حقوق بھی بعض اوقات اسے حاصل نہیں ہوتے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر ظلم و زیادتی پہلے بھی ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی رہتی ہے۔ اسلام نے قانون کے ذریعے اسے ختم کیا ہے۔ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

چار نکاح کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ

دور جاہلیت میں آدمی جتنی عورتوں سے چاہے، شادی کرسکتا تھا۔ اسلام نے بہ یک وقت چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی اور شرط یہ رکھی کہ ان کے ساتھ نان نفقہ، شب باشی اور سلوک میں عدل و انصاف اور مساوات ہو۔ کسی کے ساتھ ترجیحی رویہ نہ اختیار کیا جائے۔ اگر اس کا یقین نہ ہو تو کہا گیا کہ ایک ہی نکاح کیا جائے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النسآء: ۳)
اگر تمھیں ڈر ہو کہ بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرو گے تو صرف ایک نکاح کرو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کی اصلاً ایک بیوی ہوگی۔ وہ ایک سے زائد بیویاں رکھنا چاہے تو چار تک رکھ سکتا ہے۔ لیکن اسے ہر حال میں عدل کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ ناانصافی ہوگی تو اسلامی قانون عورت کو انصاف فراہم کرے گا۔

اختلاف حل کرنے کی تدابیر

ازدواجی زندگی میں کبھی اختلافات بھی رونما ہوسکتے ہیں۔ حکم ہے کہ ان اختلافات کو میاں بیوی خود ہی حکمت سے رفع کرنے کی کوشش کریں۔ مرد وسعت ظرف اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے، عورت کا رویہ غلط اور ناپسندیدہ ہو تو افہام و تفہیم سے کام لے۔ حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے وہ ناگواری کا اظہار بھی کرسکتا ہے اور خواب گاہ میں

اس سے الگ رہ سکتا ہے۔ وقت ضرورت کسی قدر سختی کی بھی اسے اجازت ہے، لیکن ایک حد سے آگے بڑھنے کا اسے حق نہیں ہے۔ اسی طرح عورت، مرد کے اندر بے توجہی محسوس کرے تو اپنے حقوق پر اصرار کرنے کی جگہ، حقوق چھوڑنے کے لیے آمادہ ہوجائے، اس کے باوجود تعلقات ٹھیک نہ ہوں تو دونوں طرف کے دو افراد کو حکم مان کر ان کے فیصلہ کو تسلیم کرلیا جائے۔ اس سے بھی تعلقات بحال نہ ہوں تو طلاق یا خلع کے ذریعے علاحدگی اختیار کی جائے تاکہ دونوں ازدواجی بندھن سے آزاد ہوکر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرسکیں۔ (النسآء: ۳۴،۳۵)

طلاق کا طریقہ

طلاق کی کوئی حد نہ تھی۔ آدمی جتنی مرتبہ چاہے اور جتنی مدت کے لیے چاہے طلاق دیتا اور جب جی چاہے، رجوع کرلیتا۔ اسلام نے اس پورے مسئلہ کو ایک خاص رُخ سے دیکھا اور ایک نئے ڈھنگ سے حل کیا۔ اس نے کہا کہ عقد نکاح مودت و محبت کا رشتہ ہے۔ اسے جہاں تک ہوسکے باقی رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس کا منقطع ہونا پورے خاندانی نظام کو متاثر کرسکتا ہے۔ اختلافات ہوں تو انھیں دور کرنے کی ممکنہ تدابیر، جن کی اس نے خود وضاحت کردی ہے، اختیار کی جانی چاہئیں۔ اس کے باوجود طلاق دینی ہی پڑے تو صرف دوبار وقفہ وقفہ سے دی جاسکتی ہے۔ ان میں عدت کے درمیان رجوع کا حق حاصل ہوگا۔ اگر تیسری بار طلاق دی جائے تو رجوع کا حق ختم ہوجائے گا اور اس سے دوبارہ نکاح اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ وہ کسی دوسرے مرد کے نکاح میں جائے اور وہ بھی اسے طلاق دے دے (یا اس کی موت واقع ہوجائے) اس کے بعد پہلا شوہر عورت سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے اور عورت بھی اس کے لیے آمادہ ہو تو، نئے مہر کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ... فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَهٗ ط

(البقرۃ:۲۲۹-۲۳۰)

طلاق دو بار ہے (اس میں رجوع ہوسکتا ہے) اس کے بعد یا تو دستور کے مطابق بیوی کو رکھا جائے یا بھلے طریقے سے اسے چھوڑ دیا جائے... پھر اگر اس عورت کو (تیسری بار) طلاق دی تو وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے۔

ظہار اور اس کا کفارہ

عربوں میں 'ظہار' کا طریقہ رائج تھا۔ وہ یہ کہ آدمی بیوی سے کہتا: 'انت علیّ کظهر امّی' (تم میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو) اور علیٰحدگی اختیار کرلیتا۔ اسے طلاق سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے کہا کہ یہ ایک لغو اور بے ہودہ بات ہے کہ آدمی بیوی کو ماں قرار دے بیٹھے:

اَلَّذِیۡنَ یُظٰهِرُوۡنَ مِنۡكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِهِمۡ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمۡ ط اِنۡ اُمَّهٰتُهُمۡ اِلَّا الّٰٓـئِیۡ وَلَدۡنَهُمۡ ط وَ اِنَّهُمۡ لَیَقُوۡلُوۡنَ مُنۡكَرًا مِّنَ الۡقَوۡلِ وَزُوۡرًا ط وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ ○

(المجادلۃ:۲)

تم میں سے جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کریں وہ ان کی مائیں نہیں ہوجاتیں۔ ان کی مائیں تو وہ ہیں جنھوں نے انھیں جنم دیا ہے۔ بے شک جو لوگ ظہار کرتے ہیں وہ ایک ناپسندیدہ اور غلط بات کہتے ہیں اور بے شک اللہ بڑا معاف کرنے اور بخشنے والا ہے۔

حکم ہوا کہ اگر کوئی شخص 'ظہار' کی غلط حرکت کر بیٹھے تو بیوی سے ازدواجی تعلق رکھنے سے پہلے لازماً کفارہ ادا کرے۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، اس کی استطاعت نہ ہو یا اس کی کوئی صورت نہ ہو تو مسلسل ساٹھ روزے رکھے۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ (المجادلہ:۳،۴)

ایلاء اور اس کا حکم

اہلِ عرب میں 'ایلاء' کا بھی دستور تھا۔ 'ایلاء' کے معنی ہیں عورت کو چھوڑ دینے کی قسم کھانا۔ حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں عورتوں کو تنگ کرنے کا یہ ایک طریقہ تھا۔ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد نہیں کرتا تھا، اس لیے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اس سے شادی کرلے۔ وہ قسم کھا کر بیوی سے تعلق ختم کر دیتا۔ وہ شوہر والی ہونے کے باوجود عملاً بے شوہر کے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ جاہلیت کا ایلاء سال دو سال بلکہ اس سے زیادہ عرصہ کے لیے ہوتا۔[1]

قرآن مجید نے اس ظلم کو ختم کیا اور اس کی مدت چار ماہ متعین کی۔ ارشاد ہے:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

(البقرة:۲۲۶،۲۲۷)

وہ لوگ جو اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ اس میں رجوع کرلیں تو اللہ غفور ورحیم ہے۔ لیکن اگر وہ طلاق کا ارادہ ہی کرلیں تو اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس حکم کی رو سے اگر کوئی شخص عورت کو چھوڑ دینے کی قسم کھالے اور چار ماہ کے اندر رجوع کرلے تو اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اگر اس نے طلاق ہی کا فیصلہ کرلیا ہے تو اسے طلاق دے دینی چاہیے۔ ورنہ فقہ شافعی کی رو سے حاکم تفریق کرادے گا۔ احناف کے نزدیک چار ماہ کی مدت گزر گئی اور آدمی نے رجوع نہیں کیا تو خود بہ خود طلاق واقع ہوجائے گی اور رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا۔[2]

---

[1] ابن حیان اندلسی، البحر المحیط: ۲ / ۱۹۱، دارالکتب العلمیة، بیروت ۱۹۹۳ء

[2] ایلاء پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھی جائے ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۱ / ۲۶۸-۲۶۹

حسن سلوک کی ہدایت

ان ناروا اور ظالمانہ طریقوں کے علاوہ عام زندگی میں عورت کے ساتھ طرح طرح کی زیادتیاں ہوتی رہتی تھیں اور غیر مہذب اور غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ قرآن نے حسن سلوک اور اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنے اور عورت میں کوئی کم زوری ہو تو اسے درگزر کرنے کا حکم دیا:

وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○
(النسآء:۱۹)

ان کے ساتھ معروف کے مطابق زندگی گزارو۔ اگر (کسی وجہ سے) تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے اس میں بڑی بھلائی رکھی ہو۔

آیت میں خطاب ہر اس شخص سے ہے جو ازدواجی زندگی گزار رہا ہے کہ بیوی کے ساتھ اس کی معاشرت 'معروف' کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کیے جائیں اور اس کی جائز اور معقول ضروریات پوری کی جائیں۔ اس کے ساتھ ناروا سلوک نہ کیا جائے، بلکہ پیار اور محبت کا برتاؤ کیا جائے۔ ترش روئی اور سخت کلامی سے اجتناب کیا جائے، یہ سب باتیں 'معروف' میں آتی ہیں۔ اس کے خلاف جو رویہ اختیار کیا جائے گا وہ 'غیر معروف' اور 'منکر' ہوگا۔

آیت میں ایک اہم بات یہ بتائی گئی ہے کہ عورت کے مزاج میں کوئی کم زوری بھی ہوسکتی ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس کی کوئی عادت تمھیں ناگوار گزرتی ہو، لیکن آدمی کو ازدواجی زندگی کی خاطر اسے برداشت کرنا چاہیے۔ ہر ناگواری تفریق اور جدائی کا سبب بن جائے تو ازدواجی رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات آدمی بڑائی کے احساس اور نفسانیت کی بنا پر یا جذبات سے مغلوب ہوکر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھتا ہے جو اس کے لیے سخت نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر عواقب و نتائج پر آدمی کی نظر ہو اور وہ دور تک دیکھ سکے

تو ناگوار باتیں بھی برداشت کرنا اس کے لیے آسان ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کی بہت سی ناگواریاں بعض اوقات خیر کا باعث بن جاتی اور مسرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ جس عورت سے آدمی کو شکایت ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے صالح اولاد عطا کرے یا اور کوئی بھلائی کا دروازہ کھول دے۔ اس لیے آدمی کو صبر وسکون اور حسن اخلاق کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا یفرک مومن مومنة ان کره منها خلقا رضی منها اٰخر[1]

کوئی مومن کسی مومنہ (بیوی) سے بغض اور نفرت نہ کرے اگر وہ اس کے کسی رویہ کو ناپسند کرے تو اس کا دوسرا رویہ اسے پسند آئے گا اور وہ خوش ہوگا۔

مطلب یہ کہ کوئی انسان شرِ مجسم نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اندر کم زوری ہوتی ہے تو خوبی بھی ہوتی ہے۔ آدمی کی نظر کم زوری کی جگہ خوبی پر ہونی چاہیے اور اس سے اسے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

عورت میں اگر کوئی تکلیف دہ کم زوری ہے اور وہ جڑ پکڑ چکی ہے تو آدمی کو جو رویہ اختیار کرنا چاہیے، اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے۔

حضرت لقیط بن عامر بن صبرہؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ میری بیوی کی زبان میں خرابی ہے، گندی باتیں کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے طلاق دے دو۔ میں نے عرض کیا کہ ایک عرصہ سے ساتھ رہ رہی ہے، اس سے میری اولاد بھی ہے۔ آپ نے فرمایا پھر تو اسے نصیحت کرو۔ اس کی طبیعت میں خیر ہوگا تو اس پر عمل کرے گی، لیکن جس طرح لونڈیوں کو مارتے ہو اس طرح اسے ہرگز نہ مارو۔[2]

---

[1] مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء

[2] ابو داؤد، کتاب الطهارة، باب فی الاستنثار

مطلب یہ کہ عورت میں کوئی ایسی کم زوری ہے جس سے آدمی اذیت محسوس کررہا ہے تو اس کے لیے معقول طریقہ یہ ہے کہ اس سے علٰحدگی اختیار کرلے۔ لیکن اگر اس سے پیدا ہونے والی اولاد اور طویل تعلق کا خیال ہو یا اور کوئی مصلحت ہو تو اس کی کم زوری کو برداشت کرے، وعظ و نصیحت کرتا رہے اور اصلاح کی توقع رکھے۔ یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ اس پر دستِ تعدّی دراز کرے اور مار پیٹ شروع کردے۔ اس لیے کہ وہ کوئی باندی نہیں بلکہ بیوی ہے۔

اہلِ خاندان کے حقوق و فرائض

خاندان اللہ کی نعمت ہے

ازدواجی تعلق سے پورا خاندان وجود میں آتا ہے۔ اولاد، ماں باپ، بھائی بہن اور ان کے واسطے سے بہت سے دوسرے رشتے قائم ہوتے ہیں۔ خاندان کا وجود اللہ کا فضل و احسان ہے۔ سماجی اور معاشرتی زندگی میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۙ
(النحل: ۷۲)

اللہ نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں اور تمھیں اپنی بیویوں سے بیٹے اور پوتے دیے اور کھانے کے لیے تمھیں پاک چیزیں عطا کیں۔ تو کیا پھر بھی وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔

خاندان کے افراد سے آدمی کے دور و نزدیک کے تعلقات ہوتے ہیں۔ کسی سے اس کا رشتہ براہِ راست اور کسی سے بالواسطہ ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے زندگی میں اس کے حقوق اور ذمے داریاں متعین ہوتی اور مرنے کے بعد وہ ایک دوسرے کے قانونی وارث ہوتے ہیں۔ وراثت کے احکام کے ذیل میں ارشاد ہے:

...اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ
(النسآء:۱۱)

تم نہیں جانتے کہ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹوں میں سے کون تمھارے لیے زیادہ نفع پہنچانے والا ہوگا۔

اہلِ خاندان کے قانونی حقوق

اسلام نے خاندان کی اس طرح تنظیم کی ہے کہ افراد خاندان کا ایک دوسرے سے کسی نہ کسی نوعیت کا ربط باقی رہتا ہے، لیکن ان کے درمیان تعلقات فطری طور پر مختلف سطح کے ہوتے ہیں۔ کوئی بہت قریب ہوتا ہے اور کسی سے دور کا رشتہ ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے اسلام نے ان کے حقوق اور ذمے داریاں متعین کی ہیں۔

بیوی اور بچوں کے حقوق

خاندان میں بیوی اور بچوں کے حقوق سب سے پہلے آتے ہیں۔ اسلام نے آدمی کی حیثیت کے مطابق بیوی کے نان و نفقہ، رہائش اور دیگر ضروریات کی تکمیل کی ذمے داری مرد پر ڈالی ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝
(الطلاق:۷)

جس شخص کو وسعت حاصل ہے وہ اپنی وسعت کے مطابق (بیوی پر) خرچ کرے اور جس کو نپی تلی روزی ملی ہے وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے دیا ہے۔ اللہ نے جس کسی کو جتنا دیا ہے اس سے زیادہ کی وہ اس پر ذمے داری نہیں ڈالتا۔ اللہ مشکل کے بعد جلد آسانی (بھی) پیدا فرمائے گا۔

اولاد دراصل آدمی کی ذات ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے اپنی ذات کی طرح اولاد کا نان و نفقہ بھی واجب ہے۔ قرآن نے طلاق کے احکام کے ذیل میں فرمایا:

.....وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ج لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ق وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ج ...

(البقرة: ۲۳۳)

(طلاق کے بعد اگر عورتیں دودھ پلائیں تو) جس کا بچہ ہے (یعنی باپ) اس پر دستور کے مطابق ان کے کھانے اور کپڑے کی ذمے داری ہے۔ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔ نہ تو ماں کو اس کے بچہ کے سلسلہ میں ضرر پہنچایا جائے اور نہ باپ کو جس کا بچہ ہے اس معاملے میں پریشان کیا جائے۔ جو وارث ہے اس پر بھی اسی طرح نان ونفقہ کی ذمے داری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بچہ باپ کا ہے اور اس کی رضاعت کے اخراجات برداشت کرنا باپ کی ذمے داری ہے۔ اسی سے اولاد کے نفقہ کا وجوب نکلتا ہے۔ باپ نہ ہوتو اس کے وارث پر یہ ذمے داری عائد ہوگی۔[۱]

ماں باپ کے حقوق

آدمی کا اپنے والدین سے بہت ہی قریبی تعلق ہوتا ہے۔ ان کا نان ونفقہ ادا کرنا اور ان کی ضروریات پوری کرنا واجب ہے۔

محرم رشتہ داروں کے حقوق

آدمی کے وہ رشتے دار جو محرم ہیں ان میں سے کوئی لڑکی یا کم عمر لڑکا ہے یا بالغ

---

[۱] یہاں وارث سے مراد کون ہے اس میں اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے باپ کا وارث مراد ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے خود لڑکے کا وارث مراد ہے۔ احناف کے نزدیک وارث کا خونی رشتہ کے لحاظ سے محرم ہونا ضروری ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔
ابو حیان اندلسی، البحر المحیط: ۲/۲۲۷

تو ہے لیکن اپاہج، نابینا یا کسی بھی طرح سے معذور ہے اور ضرورت مند ہے تو اس کا نفقہ اس کے وارثوں پر واجب ہوگا۔ جو شخص اس کی وراثت میں جتنے حصہ کا وارث ہوگا اس پر اس کے نان و نفقہ کی اتنی ذمے داری عائد ہوگی۔

بیوی کے حق اور دوسروں کے حق میں فرق

یہاں یہ فرق ذہن میں رہے کہ بیوی کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد کا نان و نفقہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے محتاج ہوں۔ اگر وہ صاحب حیثیت ہیں اور اپنا خرچ برداشت کر سکتے ہیں تو ان کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔ ہاں اگر ضرورت کے مطابق ان کی آمدنی نہ ہو تو اس حد تک اسے پورا کرنا ضروری ہوگا۔[1]

لڑکیاں زندہ درگور نہ ہوں گی

خاندان میں جو طاقت ور ہوتا وہ کم زور پر ظلم کے تیر چلاتا اور مختلف طریقوں سے ان کے حقوق پامال کرتا۔ خاص طور پر عورتیں اور یتیم اس کا ہدف بنتے۔

لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی، بلکہ انھیں بوجھ سمجھا جاتا۔ اس کی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ لڑکیاں زندہ درگور کر دی گئیں۔ اسلام نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اسے ایک ایسا سنگین جرم قرار دیا جس کی باز پرس سے آدمی قیامت کے روز بچ نہیں سکتا۔

وَ اِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ ج
(التکویر: ۸-۹)

جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم میں اس کی جان لی گئی تھی؟

---

[1] یہاں فقہ حنفی کا نقطۂ نظر بیان ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو: مرغینانی، ہدایہ، کتاب النکاح، باب النفقہ۔ دوسرے مسالک فقہ میں بعض امور میں کسی قدر اختلاف ہے۔

وراثت میں عورت کا حق

اسلام نے عورت کو خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے جو مقام عطا کیا اور اسے جو حقوق دیے ان میں ایک وراثت کا حق بھی ہے۔خاندان میں عورت کا کوئی مالی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ چناں چہ دورِ جاہلیت میں عورت وارث نہیں ہوتی تھی۔اسلام نے وراثت میں اسے شریک کیا اور اس کا حق متعین کیا:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ط نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ○ (النسآء:۷)

مردوں کا بھی حصہ ہے اس مال میں جو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ (ہر ایک کا) حصہ طے شدہ ہے۔

اس طرح اسلام نے خاندانی حقوق میں مرد کے ساتھ عورت کو بھی شریک قرار دیا اور دونوں کی ذمے داریوں کے لحاظ سے ان کا حصہ مقرر کیا۔

یتیم کا حق نہ مارا جائے

خاندان میں یتیموں کے ساتھ بڑا ظلم ہوتا۔ خود ان کے اولیاء اور سرپرست ان پر زیادتی کرتے اور ان کے مال اور جائداد پر قبضہ کر لیتے۔قرآن نے اس پر آخرت کی وعید سنائی اور اس سے باز رہنے کی تاکید کی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ط وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ع ○ (النسآء:۱۰)

جو لوگ یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں وہ حقیقت میں اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور جلد ہی جہنم کی دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

قرآن نے ہدایت کی کہ یتیموں کے ساتھ ہم دردی، خیر خواہی اور الفت و محبت

کا رویہ اختیار کیا جائے اور ان کے مال کی پوری طرح حفاظت کی جائے، جب وہ سنِ رشد کو پہنچیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دیا جائے اور اس کے ثبوت کے لیے گواہ بھی رکھے جائیں۔ (النساء:٦)

رشتوں کا احترام

اسلام نے خاندانی نظام کے استحکام کے لیے قوانین ہی نہیں دیے، بلکہ اخلاقی روح بھی پیدا کی ہے۔ اس نے اخلاق کی جو ہمہ جہت اور وسیع تعلیم دی اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خونی رشتوں کا احترام اور ان کی پاس داری کی جائے۔ ان کو صدمہ پہنچتا ہے تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی کے منافی بات ہوگی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۝ (النسآء:۱)

اور ڈرتے رہو اس اللہ سے جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو اور رشتوں کا پاس رکھو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھ رہا ہے۔

صلۂ رحمی کا حکم

اللہ کے نیک بندوں کی ایک خاص صفت یہ بتائی گئی کہ جن تعلقات کو جوڑنے کا انھیں حکم دیا گیا ہے انھیں وہ جوڑے رکھتے ہیں۔ اس میں رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلۂ رحمی سب سے پہلی آتی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ۝ؗ (الرعد: ۲۱)

وہ جو ان تعلقات کو جوڑتے ہیں، جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور (آخرت کے) برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

آیت میں تعلقات کو جوڑے رکھنے کا ذکر خدا کی خشیت اور آخرت کے خوف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ قرابت داروں کے حقوق ادا کیے جائیں۔ ارشاد ہے:

وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (بنی اسرائیل:۲۶) اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو۔

یہی بات اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (النحل:۹۰) کے الفاظ میں بھی کہی گئی ہے۔ یعنی اللہ کا حکم ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کیا جائے۔ یہ حقوق تعلقات کی نوعیت اور حالات کے لحاظ سے قانونی اور اخلاقی دونوں طرح کے ہیں۔

قرابت دار اور اہل خاندان دور کے ہوں یا نزدیک کے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک، ہم دردی اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا جائے گا اور ان کے دکھ درد میں شرکت کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے رسول جن باتوں کی تعلیم دیتے تھے ان میں یہ بات بھی شامل رہی ہے:

وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی ..... (البقرة:۸۳) والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور قرابت داروں سے .....

اسی حسن سلوک کو صلۂ رحمی بھی کہا جاتا ہے۔ حدیث میں اس کا بڑا ثواب بیان ہوا ہے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من سرّہ ان یُبسَطَ له رزقه ویُنسَأُ له فی اثره فلیصل رحمه۔[1] جو شخص یہ پسند کرے کہ اس کے رزق میں وسعت اور اس کی عمر میں اضافہ ہو تو صلۂ رحمی کرے۔

اسلام نے قریب کے رشتہ داروں کے قانونی حقوق متعین کیے اور دور کے رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک، تعاون اور ہم دردی کا حکم دیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ احکام وراثت کے ذیل میں ارشاد ہے کہ حق داروں کا حق ادا کیا جائے اور جن ضرورت مندوں کا قانونی حق نہیں ہے انھیں نظر انداز نہ کیا جائے۔ وہ حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ اس میں سب سے پہلے رشتہ دار آتے ہیں:

---

[1] بخاری، کتاب البیوع، باب من احب البسط فی الرزق۔ مسلم کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم و تحریم قطیعتها۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوْفًا۝ (النسآء: ۸)

جب وراثت کی تقسیم کے وقت قرابت دار، یتامیٰ اور مساکین حاضر ہوں تو ان کو اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے بھلی بات کہو۔

قطع رحم کی ممانعت

قطع رحم کی سختی سے ممانعت کی گئی۔ اسے ایمان کے منافی اور منافقانہ کردار قرار دیا گیا۔ منافقین کے بارے میں ارشاد ہے:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ۝ (محمد: ۲۲)

اگر تم دین سے پھر گئے اور کفر کی طرف پلٹ گئے تو بعید نہیں کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور قطع رحم (آپس میں خون خرابہ) کا ارتکاب کرنے لگو۔

حدیث میں قطع رحم پر سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا يدخل الجنة قاطع.[۱]

قطع رحم کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق پیدا فرمائی تو رحم (خونی رشتہ) نے اللہ تعالیٰ کا دامن پکڑ لیا اور قطع رحم سے پناہ مانگی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الا ترضين ان اصل من وصلك واقطع من قطعك

کیا تو اس سے خوش نہیں ہے کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا (میری نظر عنایت اس پر ہوگی) اور جو تجھے کاٹ دے میں اسے کاٹ دوں گا (میرے لطف وعنایت سے وہ محروم ہوگا)۔

---

[۱] بخاری، کتاب الادب، باب اثم القاطع۔ مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم و تحريم قطيعتها

اس پر رحم (خونی رشتہ) نے کہا اے اللہ میں اس سے خوش ہوں۔[1]

اسی کے ہم معنی ایک روایت حضرت عائشہؓ سے آتی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

الرحم معلقة بالعرش تقول من وصلني وصله الله و من قطعني قطعه الله.[2]	رحم عرش کو پکڑے ہوئے ہے اور کہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے اللہ اسے (اپنے سے) جوڑے رکھے اور جو مجھے کاٹ دے اللہ اسے (اپنے سے) کاٹ دے۔

صلۂ رحمی کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اس میں سلام کلام، ملاقات، حالات سے باخبر رہنا اور خوشی اور غم میں شریک ہونا جیسے متعدد امور آتے ہیں، لیکن بعض پہلوؤں سے مالی تعاون کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرہ کا ہر وہ شخص جو بہتر مادی اور معاشی حالت میں ہو وہ خاندان کے ان افراد کا تعاون کرے جو اس کے محتاج ہیں اور انھیں اس قابل بنائے کہ کاروبار حیات میں وہ اپنا فرض ادا کرسکیں۔ اسلام اس بات کو صحیح نہیں سمجھتا کہ آدمی اپنے عیش و عشرت میں مگن رہے اور خاندان کے دکھ درد کو محسوس نہ کرے اور جو تعاون کرسکتا ہے اس سے دریغ کرے۔ یہ قطع رحم کی سنگین صورت ہے۔

خاندان کی دینی اور اخلاقی تربیت

بیوی بچوں اور اہل خاندان کی مادی اور معاشی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ان کی دینی اور اخلاقی حالت درست کرنے اور اسے بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ یہ آدمی کے اپنے دین و ایمان اور اہل خاندان کے ساتھ خیر خواہی کا لازمی تقاضا ہے۔ اس سے غفلت دنیا اور آخرت کی تباہی کا سبب ہوگی۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا ہے:

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورہ محمد، باب و تقطعوا ارحاكم۔ مسلم، حوالہ سابق

[2] مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب صلة الرحم و تحريم قطيعتها

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ (التحریم:٦)

اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اولاد کی نشو و نما اس طرح ہو کہ وہ محض ایک حیوان یا بندۂ نفس بن کر نہ رہ جائیں بلکہ ان کے اندر تقویٰ، خدا ترسی اور آخرت کا خوف جاگزیں ہو۔ وہ خدا کے وفادار بندے اور خلقِ خدا کے بہی خواہ بن کر ابھریں، دنیا میں خیر کو عام کریں، شر اور فساد کو پھیلنے نہ دیں اور ان کے اندر اس راہ کی تکلیفیں برداشت کرنے کا عزم اور حوصلہ ہو۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے سے فرماتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۝ (لقمان:۱۷)

اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو، معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو اور (اس راہ میں) جو تکلیف تمھیں پہنچے اس پر صبر کرو، بے شک یہ ان کاموں میں سے ہے جو ہمت کے ہیں۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جن امور کی تعلیم دی تھی، یہ ان میں سے بعض ہیں۔ انھوں نے اور بھی نصیحتیں کیں۔ باپ اور بیٹے کے تعلق کی نوعیت دوسرے تعلقات سے مختلف ہوتی ہے۔ باپ کی نصیحت کو بیٹا حکم سمجھ کر قبول کرسکتا اور اس پر کاربند ہوسکتا ہے۔ اس کی توقع ہر کسی سے نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اس سے یہ بات ضرور نکلتی ہے کہ خاندان کے جو افراد انسان کے زیر اثر ہیں اور جو اس کی بات سن سکتے ہیں، ان سب کو خیر و صلاح کی راہ پر لگانا اس کی دینی اور اخلاقی ذمے داری ہے۔

مسائل و مباحث

- خطبۂ نکاح
- لڑکی سسرال میں
- جہیز کا بحران
- دورِ حاضر میں مسلمان عورت کے مسائل
- عورت اور معیشت
- بعض فقہی احکام
- چند معاشرتی مسائل

خطبۂ نکاح

اس عاجز نے کئی سال قبل ایک رفیق کے صاحب زادے کے نکاح کی مجلس میں خطبۂ نکاح کی مختصر سی تشریح کی تھی۔ یہ تشریح احباب کو پسند آئی۔ اس کے کیسٹ پھیلائے گئے۔ ایک رفیق نے اس کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شامل کر دیا۔ پھر یہ کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کا انداز تقریر کا تھا۔ اب اسی کو حذف و اضافے کے بعد تحریری شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ. اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

ساری تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ ہم اس کی حمد کرتے ہیں۔ اس سے مدد مانگتے ہیں۔ اس سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں اپنے نفس کی برائیوں سے اور اپنے برے اعمال کی پاداش سے۔ جس کو اللہ ہدایت دے اسے کوئی بھٹکا نہیں سکتا، اور جس کو گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

يٰٓاَ يُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا○ (النسآء:۱)

اے انسانو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رحم کے رشتوں کو ملائے رکھو، بلاشبہ اللہ (ہمہ وقت) تمھاری نگرانی کر رہا ہے۔

يٰٓاَ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ○ (آل عمران:۱۰۲)

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت آئے تو اس عالم میں کہ تم اس کے فرماں بردار ہو۔

يٰٓاَ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا○ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا○ (الاحزاب:۷۰،۷۱)

اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور جچی تلی درست بات کہو، وہ تمھارے اعمال کی اصلاح فرما دے گا، تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا، جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، اس نے عظیم کامیابی حاصل کرلی۔

و قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم أما و اللّٰه إنّی لأخشاکم للّٰه و أتقاکم له، لکنی أصوم و أفطر و اصلّی و أرقد و أتزوّج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی.

اور اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: سن رکھو، خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے اور اس کا تقویٰ رکھنے والا ہوں، لیکن میں (نفل) روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ (رات میں) نماز پڑھتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ (یہ میرا طریقہ ہے) پس جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ خطبۂ نکاح اور اس کا ترجمہ ہے۔ نکاح کی مجلس میں جو خطبہ پڑھا جاتا ہے، اس کو خطبۂ مسنونہ کہا جاتا ہے۔ اسے خطبۂ مسنونہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نکاح میں یہی خطبہ پڑھا کرتے تھے اور اسی وقت سے یہ سنت چلی آرہی ہے۔ خطبہ

کے بعد ایک حدیث پیش کی گئی ہے جن سے نکاح کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

اس خطبے میں حمد و صلوٰۃ یعنی اللہ تعالیٰ کی تعریف اور نبی اکرم ﷺ پر درود وسلام کے بعد قرآنِ شریف کے مختلف مقامات سے چار آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔ ان آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتخاب میں بڑی حکمت اور معنویت ہے۔ نکاح کے موقعے پر جو باتیں کہی جاسکتی ہیں یا جو نصیحت کی جاسکتی ہے اور دولھا دلھن کو جن امور کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے، وہ سب ان آیتوں میں بیان کردی گئی ہیں۔

ان میں سے پہلی آیت سورۂ نساء کی ہے، فرمایا: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ ''اے لوگو اپنے رب سے ڈرتے رہو۔'' آیت کا آغاز اس ہدایت سے ہوتا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس سے ڈرتے رہو۔ خطبۂ نکاح میں جو چار آیتیں پڑھی جاتی ہیں، ان میں پانچ مقامات پر تقویٰ اختیار کرنے اور اللہ سے ڈرنے کا حکم ہے۔ بار بار اور تکرار کے ساتھ اس کی ہدایت کی جارہی ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ دو موقعے ایسے ہوتے ہیں جہاں آدمی اللہ کو بھول جاتا ہے۔ ایک خوشی کا موقع اور دوسرا غم کا موقع۔ خوشی میں اللہ کے احسانات یاد نہیں آتے اور غم میں اللہ کا احترام باقی نہیں رہتا اور انسان اللہ کی شان میں زبان درازی کرنے لگتا ہے۔ کہا گیا کہ تمھاری خوشی کا موقع ہے، لیکن اللہ کو نہ بھولو، اس کے احکام کو فراموش نہ کرو، اس کی ہدایات کو نظر انداز نہ کرو، اور یہ سوچ کر زندگی گزارو کہ تمھارا ایک خالق و مالک اور آقا اور مولا ہے۔ اس سے ڈر کر زندگی گزارنے ہی میں تمھاری کامیابی ہے۔ قرآن میں بہت سے مقامات پر اس کا ذکر ہے۔ یہاں ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا: ''تمھارا رب وہ ہے جس نے تم سب کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا، پہلے آدم کو پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا (حوّاؑ) بنایا۔

اس موقعے پر اس ارشاد کی کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب کو ایک انسان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا بڑی معنویت ہے۔ اس کے ذریعے یاد دلایا جا رہا ہے کہ تمھارے درمیان ہزار فرق ہوں گے۔ رنگ روپ کا فرق ہوگا، مال و دولت کا فرق ہوگا،

علاقے کا فرق ہوگا، زبان کا فرق ہوگا، رتبے اور حیثیت کا فرق ہوگا اور علم و فضل کا فرق ہوگا، لیکن یاد رکھو! تم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے تم میں سے کوئی ہندوستان میں پیدا ہوا ہے اور کوئی عرب میں، کوئی یورپ میں پیدا ہوا ہے اور کوئی ایشیا میں۔ لیکن یہ کوئی حقیقی فرق نہیں ہے اس لیے کہ تم سب کی اصل ایک ہے۔

ارشاد ہوا ''اللہ نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس کا جوڑا بھی اسی سے پیدا فرمایا۔'' اس میں ایک بڑی حقیقت ذہن نشیں کرائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ انسانِ اول حضرت آدم کا جوڑا (حضرت حوّاؑ) ان ہی کے اندر سے تھا۔ اسی طرح تمھیں جو جوڑا مل رہا ہے وہ بھی تمھارے ہی اندر سے نکلا ہے۔ تمھارے ہی گوشت پوست کا حصہ ہے۔ اسے اپنے سے الگ نہ سمجھو۔ بعض حضرات نے اس کی یہ تعبیر کی ہے کہ حضرت آدم کا جوڑا ان ہی کی جنس سے تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارا جوڑا بھی تمھاری ہی جنس سے ہے۔ کوئی گائے بھینس نہیں ہے جو تمھارے ساتھ لگا دی گئی ہو یا تم خرید کر لے جا رہے ہو۔

ایک حدیث میں ہے کہ انسان کی بیوی اس کی پسلی سے نکلتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک حسین تعبیر ہے، میاں بیوی کے قریبی تعلق کے اظہار کے لیے شاید اس سے بہتر کوئی دوسری تعبیر نہیں ہوسکتی۔ اگر آدمی یہ مان لے کہ اس کی بیوی اس کے جسم کا ایک حصہ ہے تو اس کے ساتھ اس کا برتاؤ بھی وہ ہوگا جو جسم کے کسی عضو کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اگر خراب ہو بھی جائے تو اس کے ساتھ ہم دردی ہوتی ہے۔ اسے آسانی سے کاٹ کر پھینکنے کی کوشش نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

وَ بَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّ نِسَآءً ... یعنی حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور دنیا میں پھیلا دیں۔ اس طرح نسل انسانی کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس کے لیے مرد اور عورت دونوں کی ضرورت تھی۔ کسی ایک سے یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ لہٰذا ان میں سے کوئی نہ برتر ہے اور نہ کم تر۔ دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔

ان الفاظ کے ذریعے ازدواجی تعلق کا ایک اہم مقصد بیان ہوا ہے۔ وہ ہے نسل انسانی کا پھیلنا۔ اس کے بغیر محض جنسی تلذّذ نکاح کا حقیقی مقصد نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ایسے خاندان میں نکاح کرو جہاں اولاد پیدا ہوتی ہے۔ کل قیامت کے روز میں تمھاری کثرت پر فخر کروں گا۔‘‘

بات ابھی جاری ہے۔ فرمایا: ’وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ‘ تقویٰ کی پھر تاکید ہے کہ اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کا نام لے کر تم ایک دوسرے کے حقوق کا اور تعاون کا سوال کرتے ہو۔ جب مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں تو اسی کے نام سے حل کرنا چاہتے ہو۔ اس سے ہمیشہ ڈرتے ہو، رشتوں کا خیال رکھو اور قطع رحم سے بچو۔ اس وقت نئے رشتے قائم ہو رہے ہیں۔ آج جو بیوی ہے کچھ دن بعد ماں ہوجائے گی، شوہر ہے جلد ہی باپ بن جائے گا۔ پھر ان سے ایک نیا خاندان وجود میں آئے گا۔ رشتے قائم ہوں گے، کوئی بھائی ہے، کوئی بہن ہے، کوئی چچا ہے، کوئی ماموں، کوئی پھوپھی ہے، کوئی خالہ، کوئی دادا ہے کوئی نانا۔ اس مناسبت سے پہلے ہی قدم پر رشتوں کے احترام کی تاکید کی گئی۔ یہ بات اس لیے بھی یاد دلائی گئی کہ آدمی ایک خاندان کا فرد ہے۔ ازدواجی تعلق کی خوشی میں دوسرے رشتوں کو نہ بھول جائے۔ بلاشبہ اب نیا رشتہ وجود میں آرہا ہے۔ اس میں بڑی کشش ہے۔ اس کا احترام کرنا اور اس کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے، لیکن کچھ اور رشتے بھی ہیں۔ اس نئے رشتے کے نتیجے میں ان کو نہ بھولو۔ اس کے بعد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا... ڈرتے رہو اللہ سے، اللہ دیکھ رہا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ کہیں وہ غائب ہے، اس کی نگاہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اس لیے یہ سوچ سمجھ کر نئی زندگی کا آغاز کرو کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اگر تم نے اس موقع پر کوئی غلط حرکت کی، سنت یا شریعت کے احکام کے خلاف کوئی کام کیا تو ایسا نہیں ہے کہ اللہ کی نگاہ سے وہ چھپ جائے اور تم اس کی گرفت سے بچ جاؤ۔ خوشی کے اس موقعے پر اس سے بڑی بات اور کیا کہی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔

دوسری آیت سورۂ آل عمران کی ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے:
'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ' (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنا چاہیے) تقویٰ کے معنی ہیں خداترسی کی راہ اختیار کرنا، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنا اور اس کی معصیت سے بچنا۔ آیت میں جو بات کہی گئی ہے بعض اوقات اس کی اہمیت محسوس نہیں کی جاتی۔ یہ خیال ذہن کے کسی نہ کسی گوشہ میں ہوتا ہے کہ جب ہم خدا اور رسول کو مانتے ہیں، شریعت کے احکام سے واقف ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں تو اس کے تقاضے پورے ہو ہی رہے ہیں۔ لیکن غور طلب پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید نے یہاں صرف تقویٰ کا حکم نہیں دیا ہے، بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تقویٰ کا حق ادا کیا جائے اور پوری طرح خدا سے ڈرکر زندگی گزاری جائے۔ یہ ایک دشوار عمل ہے۔ تقویٰ کا حق ادا کرنا بظاہر کم زور انسان کی استطاعت سے باہر ہے۔ اس سے اس کی ہمت پست ہوسکتی ہے اور تقویٰ کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ بھی سکتا ہے۔ اس لیے دوسری جگہ فرمایا 'فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ' (اللہ سے ڈرتے رہو جتنی تم میں استطاعت ہے)۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس کے اندر کتنی استطاعت ہے اور کون سا عمل اس کی استطاعت سے باہر ہے۔ اسی لحاظ سے وہ اس کے ساتھ معاملہ کرے گا۔ تقویٰ کی کیا اہمیت ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں اسے بعد کے الفاظ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ارشاد ہے:

'وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ' (تمھیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو)۔

مطلب یہ کہ زندگی بھر اور مرتے دم تک اسلام پر قائم رہو۔ جب بھی موت کا فرشتہ آئے، جوانی میں، پیری میں، حالت صحت میں، مرض کی کیفیت میں، دن کے اجالے میں، رات کے اندھیرے میں، سوتے یا جاگتے میں، سفر یا حضر میں، تمھیں اسلام کی حالت میں پائے اور اللہ کے فرماں بردار کی حیثیت سے اس کے دربار میں پہنچو۔

یہاں ایک خیال ذہن میں آسکتا ہے وہ یہ کہ شادی اور خوشی کے موقع پر موت کے ذکر کی کیا معنویت ہے، کیا یہ بے محل بات نہیں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عقدِ نکاح کے ذریعے ایک مرد اور ایک عورت زندگی کا نیا سفر شروع کرتے اور نئی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اس وقت انھیں یاد دہانی کرائی جارہی ہے کہ زندگی کے اس نئے سفر میں بہت سے نشیب وفراز آسکتے ہیں، لیکن تمھیں اس عزم کے ساتھ قدم بڑھانا چاہیے کہ جب تک جان میں جان اور سانس کی آمد و رفت ہے، اللہ کے فرماں بردار رہوگے اور کسی حال میں اس کی اطاعت وفرماں برداری کی راہ سے انحراف نہ کروگے۔

تیسری اور چوتھی آیات سورۂ احزاب کے آخری رکوع کی ہیں۔ ان کا آغاز بھی تقویٰ ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ ارشاد ہے: 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ' (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو)۔ تقویٰ کی طرف قدم قدم پر اس طرح متوجہ کرنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ اس موقع پر قدیم رشتہ داریوں کے ساتھ جدید تعلقات بھی وجود میں آرہے ہیں۔ شادی کے بعد ایک عرصہ تک آدمی پر جذباتی کیفیت طاری رہتی ہے اس میں ان تعلقات کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لیے بار بار تقویٰ پر زور دیا گیا اور تاکید کی گئی کہ آدمی اللہ سے ڈر کر اپنا رویہ متعین کرے اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے رشتوں کا احترام مجروح ہو اور حقوق ادا ہونے سے رہ جائیں۔

اس کے بعد فرمایا: 'وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا' (اور سیدھی سچی بات کہو)۔ ان الفاظ کے ذریعہ نکاح کے سیاق میں ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ آدمی بظاہر دو لفظ بول کر ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوجاتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح تازہ رہنی چاہیے کہ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ ایک سنجیدہ عہد و پیمان ہے جو اپنے ساتھ بہت ہی ذمہ داریاں رکھتا ہے، اس لیے زوجین میں سے ہر ایک کو بہت سوچ سمجھ کر رشتۂ نکاح کو منظور کرنا چاہیے۔ اسے ہنسی مذاق یا وقتی تفریح کا عمل تصور کرنا بہت بڑی

نادانی ہوگی۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

ثلاث جدّھن جدّ و ھزلھن جدّ، النکاح والطلاق والرجعة. [1]

تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے متعلق جو سنجیدہ بات کہی جائے گی وہ سنجیدہ ہی سمجھی جائے گی (اور اس کے حقیقی معنی مراد ہوں گے) اور جو مذاق میں کہی جائے گی وہ بھی سنجیدہ ہی متصور ہوگی۔ وہ ہیں نکاح، طلاق اور اس سے رجوع۔

بعض روایتوں میں اسی ذیل میں غلام کو آزاد کرنے کا ذکر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح، طلاق اور اس سے رجوع یا غلام کو آزاد کرنا یہ وہ امور نہیں ہیں، جن میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کیا جائے۔ اگر آدمی مذاق میں بھی اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھائے تو وہ نافذ ہوجائے گا۔

اس کے بعد فرمایا: '**يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ**' (وہ تمھارے اعمال کو درست کردے گا اور تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا)۔

نکاح کے سیاق میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم تقویٰ کی زندگی گزارنا چاہتے ہو اور اسی مقصد سے نکاح کر رہے ہو تو اللہ تمھارے اعمال کی اصلاح فرمائے گا اور انھیں بگاڑ اور فساد سے بچائے گا اور تمھیں راہ راست پر چلائے گا۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ تین طرح کے انسانوں کی لازماً مدد فرماتا ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اس مقصد سے نکاح کرتا ہے کہ عفت اور پاک دامنی کی زندگی گزارے۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

تقویٰ کی راہ اختیار کرنے کے باوجود آدمی لغزشوں اور کوتاہیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اطمینان دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے کرم سے معاف فرمادے گا۔ جو شخص تقویٰ کی زندگی گزارے اس پر اللہ کا یہ بہت بڑا احسان ہوتا ہے کہ وہ اس کی حسنات کو شرفِ قبولیت عطا کرتا اور اس کی سیئات کو معاف کردیتا ہے۔

---

[1] رواه الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجه (مشکوٰة المصابيح، کتاب النکاح، باب الخلع والطلاق، مع مرقاة المفاتيح، ۶/۴۲۶، ۴۲۷

آیت کے آخری الفاظ ہیں:

وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا (اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے بڑی کامیابی حاصل کی)۔

اس دنیا میں ہر شخص کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ شادی کے موقع پر بھی وہ کامیابی کے خواب دیکھتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ کامیاب کون ہے اور ناکام کون؟ کامیاب وہ نہیں ہے جسے دولتِ دنیا مل گئی، جو زمین جائداد اور کوٹھی کا مالک ہوگیا اور ریاست و اقتدار جس کے ہاتھ آ گیا، بلکہ کامیاب وہ ہے جس کی گردن میں اللہ اور اس کی اطاعت کا قلادہ ہے اور جو ہر سود و زیاں سے بے نیاز ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہا ہے۔ وہ کامیابی کے اس مقامِ بلند پر ہے کہ کوئی دوسرا اسے پا نہیں سکتا۔

یہ ان آیتوں کا سیدھا سادا ترجمہ اور اس کا مفہوم ہے۔ ان پر غور کرنے سے اس یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ نکاح کے مبارک موقع کے لیے ان سے بہتر آیتوں کا انتخاب نہیں ہوسکتا۔

خطبہ کے آخر میں رسول اللہؐ کی ایک حدیث پیش کی گئی ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ بعض صحابہؓ نے آپ کی ایک زوجۂ محترمہ سے آپ کے شب و روز کے معمولات دریافت فرمائے۔ جب یہ بیان ہوئے تو انھوں نے اسے بہت کم تصور کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مغفرت فرما دی ہے اس لیے تھوڑا سا عمل بھی آپ کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ اس جذبہ سے ان میں سے ایک نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھوں گا، آرام نہیں کروں گا، دوسرے نے کہا میں مسلسل روزے رکھوں گا اور کبھی ترک نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں تو شادی ہی نہیں کروں گا، تاکہ اللہ کی عبادت کے لیے یکسوئی حاصل رہے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان باتوں کا علم ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

اما واللہ انی لاخشاکم للہ و اتقاکم لہ لکنی اصوم و افطر و اصلی و ارقد و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی.[1]

سن رکھو! خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے اور اس کا تقویٰ رکھنے والا ہوں لیکن میں (نفل) روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ (رات میں) نماز پڑھتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے، جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ حدیث تقویٰ اور دین داری کے راہبانہ تصور کی تردید کرتی ہے۔ رہبانیت یہ ہے کہ آدمی رات دن اللہ کی عبادت و ریاضت میں اس طرح لگ جائے کہ دنیا سے اس کا تعلق کم زور سے کم زور ہوتا چلا جائے اور بالآخر ختم ہوجائے۔ حالاں کہ حقیقی دین داری یہ ہے کہ آدمی کا ایک طرف اللہ تعالیٰ سے تعلق قوی سے قوی تر ہو اور دوسری طرف وہ انسانوں کے حقوق کو فراموش نہ کرے۔ اسی میں جسم و جان اور بیوی بچوں کے حقوق آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پاکیزہ سیرت سے اسی کا ثبوت پیش فرمایا ہے۔ یہ حدیث اور آپ کا اسوۂ حسنہ بتاتا ہے کہ ازدواجی زندگی آپ کی سنت ہے۔ اس سے انحراف آدمی کو اس راہ سے ہٹا دے گا جو آپ نے بتائی ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح۔ مسلم، کتاب النکاح

لڑکی سسرال میں

آج جدھر دیکھئے ہمارے ملک میں لڑکیوں پر سسرال والوں کی زیادتی کا ذکر عام ہے۔ کبھی جہیز کے نہ لانے یا کم لانے پر اسے مارا پیٹا جاتا ہے، کبھی اسے بد اخلاق اور زبان دراز بتایا جاتا ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ آرام طلب اور کام چور ہے، کبھی اسے اس لیے پریشان کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر سلیقہ اور تہذیب نہیں ہے، کبھی شکل وصورت کی خرابی اور تعلیم کی کمی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ عام حالات میں عورت اسے زندگی کا لازمی مرحلہ سمجھ کر خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے، لیکن اگر وہ اپنے دفاع کی کوشش کرے اور حرفِ شکایت زبان پر لائے تو اس کے خلاف سخت سے سخت اقدامات ہوسکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تو ایک عام بات ہے کہ ساز وسامان اور زیورات کے ساتھ فرار ہونے کا الزام لگا کر اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو بے دردی سے اس کی جان لینے کے بعد یہ اعلان ہو جاتا ہے کہ باورچی خانہ میں جل کر مرگئی یا بجلی کے جھٹکے کا شکار ہوگئی یا چھت سے گر پڑی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ان اعلانات میں کوئی صداقت نہیں ہوتی۔ اسے ایک سنگین جرم پر پردہ ڈالنے کی ناپسندیدہ کوشش ہی سمجھا جاتا ہے۔ حالات زیادہ خراب ہوتے ہیں تو بے چاری خود بھی تنگ آکر خودکشی اور خودسوزی کر بیٹھتی ہے۔ شاید اس سے پہلے بھی یہ سب کچھ ہوتا تھا، لیکن اس کا ذکر ایک چھوٹے سے دائرے میں ہوکر رہ جاتا تھا۔ لیکن موجودہ ذرائع ابلاغ کی وجہ سے اس کا چرچا عام ہونے

لگا ہے۔ ان ذرائع سے جو تھوڑی بہت اطلاعات مل پاتی ہیں ان سے پورے ملک کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اصلاً یہ مسئلہ غیر مسلم سماج کا ہے۔ اس پر اس کے مفکرین اور مصلحین کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ لیکن اس کا اثر مسلمانوں پر بھی ہے۔ مسلمانوں میں بھی ساس بہو کے جھگڑے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ طرح طرح سے عورت کو سسرال میں پریشان کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں چند باتوں کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہمیں لڑکی کے بارے میں سوچتے وقت لڑکے کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سے بہت سی الجھنیں دور ہوسکتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکی کا اپنی سسرال سے تعلق بالواسطہ ہوتا ہے۔ اس میں براہِ راست وہ کشش نہیں ہوتی جو خونی رشتوں میں ہوتی ہے۔ ایک اجنبی لڑکی کو لڑکے کے رشتہ داروں سے اتنی ہی محبت ہوسکتی ہے جتنی کہ خود لڑکے کو اپنے سسرال والوں سے ہوتی ہے۔ لڑکا اپنی بیوی کی وجہ سے سسرال سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح لڑکی کا تعلق سسرال سے محض اپنے شوہر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ دونوں درمیان سے ہٹ جائیں تو تعلق کی کوئی مضبوط بنیاد باقی نہ رہے گی اور ایک طرح کی اجنبیت حائل ہوجائے گی۔ اس لیے اگر دونوں طرف کے خاندان والوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے کہ انھیں بہو اور داماد کی بالواسطہ محبت ملی ہے تو بے جا توقعات قائم نہیں ہوں گی اور شکوہ شکایت کی صورت نہ پیدا ہوگی۔

(۲) اس حقیقت کو ماننا چاہیے کہ شادی کے بعد لڑکے کی زندگی میں ایک نئی شخصیت داخل ہوگئی ہے۔ وہ اس کی رفیقۂ حیات اور ہم سفر ہے۔ ان دونوں کو مل جل کر اپنی زندگی کا منصوبہ بنانا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر غیر معمولی الفت و محبت رکھ دی ہے۔ اسی محبت کی وجہ سے وہ زندگی بھر ایک دوسرے کا جی جان سے تعاون کرتے ہیں اور حالات کے سرد و گرم کو بہ خوشی برداشت کرتے ہیں۔ اس محبت سے لڑکی کے والدین کو تو مسرت ہوتی ہے۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ لڑکی اپنے

شوہر کی محبت سے شادماں و شادکام ہے، لیکن لڑکے کے والدین خاص طور پر اس کی ماں پر اس کا دوسرا ردّ عمل ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اب لڑکے کے دل میں صرف ان کی محبت نہیں رہ گئی ہے، بلکہ اس میں اس کی بیوی بھی شریک ہوگئی ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ لڑکا اپنی بیوی کو چاہ رہا ہے اور اس سے غیر معمولی محبت کر رہا ہے تو خود لڑکے سے بدظن ہونے لگتے ہیں اور اس کی بیوی کو حریف سمجھ بیٹھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد بھی لڑکے کی محبت صرف ان کے لیے مخصوص ہوکر رہے اور بیوی سے اس کا تعلق محض رسمی ہو۔ یہ بالکل غیر فطری بات ہے۔ اس کی توقع ہرگز نہ رکھنی چاہیے۔

(۳) شادی کے بعد لڑکے اور لڑکی پر جنسی جذبات کا شدید غلبہ ہوتا ہے۔ وہ اس کی بار بار تسکین چاہتے ہیں۔ یہ ان کی جوانی کا فطری تقاضا ہے، لیکن بعض اوقات گھر کے بڑے بزرگوں کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے یہ کوئی غلط اور ناپسندیدہ تعلق ہے، حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک جائز اور پسندیدہ تعلق ہے۔ اس سے انسان کو ذہنی اور جسمانی سکون ملتا ہے اور یہ میاں بیوی کے درمیان محبت کے پیدا ہونے اور بڑھنے کا ایک فطری ذریعہ ہے۔ شریعت کے نزدیک اس تعلق پر انسان اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس میں بے اعتدالی ضرر رساں ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے مناسب طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ اس پر ناگواری کا اظہار یا قدغن لگانے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ اس سے لڑکے اور لڑکی دونوں ہی پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ جنسی تعلق میں جب انھیں اتنی آزادی نہیں ملتی جتنی کہ انھیں فطری طور پر ملنی چاہیے تو ان کے اندر مجرمانہ ذہنیت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ ایک طرح کے ذہنی تناؤ اور کشمکش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس معاملے میں گھر کے بڑے بزرگ بالعموم اپنا دورِ شباب بھول جاتے ہیں کہ انھیں اپنے بزرگوں کے اس طرح کے رویہ سے کتنی تکلیف پہنچتی تھی اور وہ کس طرح اسے اپنی حق تلفی اور ایک طرح کی زیادتی سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی یہ زیادتی بھی ہوتی ہے کہ جنسی تعلق میں بے اعتدالی کا اصل مجرم لڑکی کو سمجھا جاتا ہے۔ جیسے لڑکا بہت

معصوم سرشت ہے، حالاں کہ یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔ اس سے لڑکی کے دل میں سسرال والوں کی محبت کیا پیدا ہوگی نفرت اور بیزاری بڑھے گی۔

(۴) اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات لڑکی میں بھی کم زوریاں ہوتی ہیں۔ کبھی اس میں خاندانی غرور ہوتا ہے، کبھی اسے اپنی حیثیت پر ناز ہوتا ہے، کبھی وہ تیز مزاج اور جھگڑالو ہوتی ہے، کبھی اس کے اندر اطاعت اور وفا شعاری کے جذبے کی کمی ہوتی ہے۔ اس کی ان کم زوریوں کو اس کے والدین تو برداشت کرتے رہتے ہیں، بلکہ بسااوقات اپنی محبت کی وجہ سے ان کم زوریوں کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے، لیکن مختلف نفسیاتی عوامل کی بنا پر سسرال والوں سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ان کے اندر محبت کے وہ جذبات نہیں ہوتے جو لڑکی کے والدین میں ہوتے ہیں، اس لیے اس کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ سسرال میں اس کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اس کے لیے بھی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ ایک لڑکی جو کم عمر اور ناتجربہ کار ہوتی ہے اسے اچانک ایک نئے ماحول سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس ماحول سے پوری طرح واقف بھی ہوجائے گی اور خود کو اس سے ہم آہنگ بھی کرلے گی۔ یہ توقع بے جا ہے۔ ہر خاندان کے بلکہ ہر فرد کے معمولات اور طور طریقے الگ ہوتے ہیں۔ کھانے، پینے اور پہننے اوڑھنے کا ذوق جدا ہوتا ہے۔ لڑکی کو سسرال کے ذوق اور مزاج کو سمجھنے، اپنے مذاق کو چھوڑ کر ان کے مذاق کو اختیار کرنے، اپنے مذاق سے انھیں قریب کرنے میں وقت لگے گا۔ اس کی عمر سیکھنے کی ہوتی ہے۔ اگر اسے محبت سے سمجھایا جائے اور جلد بازی نہ کی جائے تو اصلاح ہوسکتی ہے، لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جس طرح گرفت ہوتی اور خردہ گیری کی جاتی ہے۔ اس سے اصلاح کے امکانات کم سے کم ہونے لگتے ہیں۔ اس میں اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ آنے والی لڑکی میں کچھ خوبیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھایا بھی جاسکتا ہے۔

محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اگر آنے والی لڑکی کو محبت ملے تو اس کے دل میں بھی محبت ابھرے گی۔ انسان محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ لڑکی جب دیکھے گی کہ سسرال والے اسے چاہ رہے ہیں اور اس کے وجود سے خوش ہیں تو وہ دیوانہ وار ان سے محبت کرے گی۔ اس کے برخلاف جب وہ دیکھتی ہے کہ وہ گھر کی مالکہ بن کر نہیں آئی ہے، شریک حیات بھی شاید نہیں ہے، محض پھوہڑ قسم کی ایک خادمہ ہے تو اس کے اندر منفی ردعمل ابھرتا ہے۔ یا تو وہ بزرگوں کی بالادستی بہ جبر و اکراہ قبول کرلیتی ہے اور اس کی جو حیثیت متعین کی جائے اسے چار و ناچار تسلیم کر کے زندگی کے دن کاٹنے لگتی ہے یا اس کے اندر بغاوت کے جذبات ابھر آتے ہیں اور گھر محاذِ جنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

آج بھی مسلم معاشرے میں ایسے خاندان بہ کثرت موجود ہیں جہاں ان باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے ساس بہو کے جھگڑے کم ہوتے ہیں اور خوش گوار زندگی گزرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود عام طور پر دونوں طرف زندگی بھر ایک حجاب باقی رہتا ہے۔ بہو بیٹی نہیں بن پاتی اور ساس ماں نہیں ہوتی۔ اسلام نے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ کوئی لڑکی سسرال میں رہنا نہ چاہے تو اس کا خاوند اسے الگ رکھے۔ یہ اس قدر معقول حل ہے کہ اگر اس پر عمل ہو تو مسلمان خاندان جھگڑوں سے پاک ہو سکتے ہیں اور ان کی خانگی زندگی دوسروں کے لیے بھی نمونہ بن سکتی ہے۔

جہیز کا بحران

جہیز! کتنا بھیانک ہے یہ لفظ؟ کبھی لفظ صوتی لحاظ سے بھیانک ہوتا ہے اور کبھی معنیٰ کے لحاظ سے۔ غالباً یہاں دوسری صورت ہے۔ جہیز کے لفظ کو اس تصور نے بھیانک بنا دیا ہے جو اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ لفظ پر زمانے کے اثرات بھی پڑتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ماضی میں 'جہیز' نئے رشتہ کے ساتھ ہم دردی اور تعاون کا محض ایک ذریعہ ہو اور اس کے ذکر سے اخوت اور محبت کے جذبات ابھرتے ہوں، یا کم از کم وہ اتنا بھیانک نہ رہا ہو جتنا آج ہے۔ اب اس نے بہرحال بڑی خوف ناک شکل اختیار کرلی ہے۔

آج ماں باپ کی ذمے داری صرف یہی نہیں ہے کہ لڑکی کی پرورش کریں، اسے تعلیم دیں، اس کی دینی و اخلاقی تربیت کریں، اسے گھر گرہستی کے آداب و اطوار اور تہذیب و سلیقہ سکھائیں، اس کے لیے رشتہ تلاش کریں اور دستور کے مطابق کسی شریف آدمی کے نکاح میں اپنی لختِ جگر کو دے کر اپنے فرض سے سبک دوش ہوجائیں، بلکہ یہ بھی ان کی ذمے داری ہے اور بہت بڑی ذمے داری ہے کہ جس لڑکے کو انھوں نے اپنی لڑکی کے لیے منتخب کیا ہے اس کے وہ مطالبات بھی پورے کریں جنھیں شاید وہ خود بھی پورے نہیں کرسکتا۔ ان مطالبات کی فہرست اتنی طویل اور اتنی متنوع ہوتی ہے کہ اس میں نقد کے علاوہ دولھا کے شایانِ شان خلعت اور جوڑا، گھڑی، سائیکل، اسکوٹر، کار، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ دنیا بھر کی چیزیں آجاتی ہیں۔ یہ فہرست حسب حالات مختصر بھی ہوسکتی ہے اور طویل بھی۔ بہرحال یہی وہ زریں موقع ہوتا ہے جب کہ دولھا میاں اور ان کے خویش و اقارب اپنے حوصلے اور تمنائیں پوری کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ لڑکی کو مطلوبہ زیورات سے آراستہ کیا

جائے، اسے اتنے ساز و سامان کے ساتھ رخصت کیا جائے کہ آدمی کی قسمت جاگ اٹھے اور گھر سچ مچ نگار خانہ بن جائے۔ لڑکی کو دیے جانے والے اس مال و اسباب کی قیمت تو متعین نہیں ہے۔ البتہ اتنی بات طے ہے کہ اسے لڑکی والے کی حیثیت سے بہر حال زیادہ ہونا چاہیے۔

ہوسِ زر اس قدر بڑھ گئی ہے کہ لڑکی کی شکل و صورت، تعلیم و تربیت اور دین و اخلاق سب کچھ اس کے مقابلہ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ لڑکی کتنی دولت اپنے ساتھ لاسکتی ہے۔ حسن و جمال ہی کی نہیں دین و اخلاق کی بھی اس قدر توہین شاید ہی دنیا نے کبھی دیکھی ہو۔ دولت نے ہر اعلیٰ قدر کو شکست دے رکھی ہے۔ شکست فاش!

جہیز سوسائٹی میں آدمی کی حیثیت ہی کا نہیں عزت و شرافت کا بھی معیار ہے۔ جو شخص جہیز کے نام پر جتنی زیادہ رقم خرچ کر سکے اس کی لڑکی کے لیے اتنا ہی 'اچھا' اور 'معیاری' لڑکا مل سکتا ہے۔ جو شخص جہیز نہ دے سکے وہ کم حیثیت اور فرو مایہ ہے۔ وہ اپنی لڑکی کے لیے کسی موزوں اور معقول رشتہ کی توقع نہیں کر سکتا۔ اگر کسی نے اپنی ایک لڑکی کے ساتھ یہ زیادتی کی کہ بغیر جہیز کے اسے رخصت کر دیا تو اس کی دوسری لڑکیوں کا خدا ہی حافظ۔ اب اسے آسانی سے رشتے مل نہیں سکتے۔ اس طرح کے کنجوس یا کنگال کے گھر آنا ظاہر ہے کون پسند کرے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی لڑکیاں لمبی عمر تک محض اس لیے بیٹھی رہتی ہیں کہ بدقسمتی سے وہ ایسے ماں باپ کے گھر پیدا ہوگئیں جو ان کے لیے جہیز فراہم نہیں کر سکتے۔ ان میں کتنی ہی مظلوم اور بے زبان زندگی بھر کنواری رہ جاتی ہیں۔ کچھ نیک بخت صورت حال کی نزاکت کا احساس کر کے از خود شادی سے انکار کر دیتی ہیں تاکہ ان کے والدین ان کی شادی کی فکر سے آزاد ہوجائیں اور وہ اپنی اُمنگوں اور تمناؤں کا مرثیہ پڑھتی ہوئی زندگی گزار دیں۔ اس کے علاوہ برصغیر میں مشترک خاندان کا عام رواج ہے۔ جب کسی خاندان میں لڑکوں کی شادیاں ہوتی چلی جاتی ہیں اور لڑکیاں کنواری رہ جاتی ہیں

تو خاندان کے اندر بڑی نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور خانگی زندگی کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ناکتخداؤں کا وجود اس ظالم سماج کے خلاف مسلسل فریاد ہے۔ لیکن کون ہے جو ان بے نواؤں کی فریاد سنے؟

بڑا مسئلہ اس لڑکی کا ہے جو جہیز کے بغیر اپنے شوہر کے گھر چلی جائے۔ اس میں ہزار خوبیاں سہی، اس کی یہ غلطی معاف نہیں ہوسکتی کہ وہ خالی ہاتھ اپنے میکے سے آئی ہے۔ اس سے باز پرس کرنے والا صرف اس کا شوہر ہی نہیں ہوتا، بلکہ شوہر کا پورا خاندان اس کا محاسب ہوتا ہے۔ اسے اپنے اس ناکردہ جرم کا ایک ایک فرد کو حساب دینا پڑتا ہے۔ اس کی عام سزا تحقیر و تذلیل، طنز و تعریض چرکے اور کچوکے اور مار پیٹ ہے۔ اس کے نتیجہ میں اسے بہ یک بنی و دوگوش خانہ بدر بھی کیا جاسکتا ہے اور شوہر سے علاحدگی بھی ہوسکتی ہے۔ یہی نہیں اس 'جرم' کی پاداش میں اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ جہیز کے لیے جان لینے کے واقعات اس کثرت سے ہو رہے ہیں کہ ان میں کوئی ندرت اور نیا پن نہیں ہے۔ ان کی نوعیت روز مرہ کے حادثات کی ہوکر رہ گئی ہے۔ کبھی یہ سزا شوہر نامدار دیتا ہے۔ اگر اسے اس میں کوئی تامل یا ہچکچاہٹ ہو تو خاندان کے دوسرے افراد اس خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔

جہیز کے مسائل و مصائب سے رست گاری حاصل کرنے لیے عورت خودکشی کو بھی ترجیح دینے لگتی ہے۔ اس کے لیے کبھی وہ مٹی کے تیل اور پٹرول کا سہارا لیتی ہے، کبھی کسی اونچی عمارت سے چھلانگ لگاتی ہے، کبھی گلے میں پھندا لگا کر چھت سے لٹک جاتی ہے، کبھی زہر کھا کر ہمیشہ کی نیند سو جاتی ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کتنی معصوم جانیں اس خون آشام جہیز کی نذر ہوچکی ہیں اور ابھی کتنی نذر ہوں گی۔ اس بہیمیت سے جنگل کے درندے بھی شرما رہے ہوں گے۔

جہیز کی ان ہلاکت خیزیوں کو آج ہر شخص اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، بلکہ دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود معاشرہ کی بہت بڑی اکثریت نے اسے ایک ناگزیر سماجی خرابی کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔ اس کے نزدیک موجودہ حالات میں لڑکوں

کے لیے جہیز لینا اور لڑکیوں کو جہیز دینا اس قدر ضروری ہوگیا ہے کہ اس سے دامن کش رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ لڑکیوں کو بہرحال جہیز دینا ہی پڑتا ہے (اس میں لڑکے کے مطالبات کی تکمیل بھی شامل ہے) اس کے بغیر ان کی شادی نہیں ہوسکتی۔ ماں باپ اس کی ہمت نہیں کرسکتے کہ ان کی لڑکی بن بیاہی گھر بیٹھی رہے۔ جو شخص جہیز دیتا ہے وہ جہیز لینے پر مجبور بھی ہے۔ اس سے یہ مطالبہ بے جا ہوگا کہ وہ تو اپنی لڑکیوں کو جہیز کے ساتھ رخصت کرے اور دوسروں کی لڑکیاں اس کے گھر خالی ہاتھ آئیں۔ ہوسکتا ہے اس نقصان کو بعض لوگ جھیل جائیں، ہر شخص اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

اس منطق کی رو سے سوچیے، وہ انسان کتنا بدقسمت ہوگا جس کے صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں اور جو ریاضی کے اس فارمولے کے تحت نقصان پر نقصان اٹھاتا رہے، اور پھر کتنا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کے صرف لڑکے ہوں اور جو جہیز کی دولت سے مسلسل نہال ہوتا چلا جائے۔

پھر اس منطق کا حاصل یہ ہے کہ کسی برائی کو ہم محض اس وجہ سے نہ صرف یہ کہ گوارا کریں بلکہ اسے عملاً اختیار کرلیں کہ دنیا اس کا ارتکاب کر رہی اور اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس طرح آدمی رشوت، خیانت، فریب اور مکاری کو بھی جائز قرار دے سکتا ہے، اس لیے کہ یہ نسخے آج کی دنیا میں بڑے ہی مجرب اور کامیاب نسخے ہیں۔ جو انھیں استعمال نہیں کرتا وہ سراسر نقصان میں رہتا ہے۔

اس قسم کی غلط توجیہات دنیا کی ہر بِرائی کو استحکام عطا کرتی ہیں۔ ان سے انسان کے ضمیر میں اس کے خلاف جو خلش ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہتی ہے اور وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہیز کے نام پر جو زیادتی ہو رہی ہے اسے دنیا کا کوئی مذہب، کوئی فلسفۂ اخلاق اور کوئی قانون جائز قرار نہیں دے سکتا۔ آج کل ہمارے ملک کے اخبارات کا ایک خاص موضوع یہی جہیز ہے۔ اس کے خلاف مختلف حلقوں سے آواز

اٹھتی رہتی ہے۔ حکومت بھی قانون کے ذریعے اس پر پابندی لگانا چاہتی ہے۔ لیکن کسی بھی خرابی کو دور کرنے کے لیے حکومت اور سماج کا دباؤ کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ذہن وفکر کی تبدیلی اور خدا اور آخرت کے خوف کی ضرورت ہے۔ اسلام یہی فرض انجام دیتا ہے۔ وہ سب سے پہلے سماج کے غلط بندھنوں کو توڑتا اور زندگی کا صاف ستھرا اور آسان طریقہ سکھاتا ہے۔ اس کے لیے اس نے کسی بھی معاملہ کو پر پیچ نہیں رکھا کہ آدمی کے لیے جینا دوبھر ہوجائے۔ چناں چہ اس نے ازدواجی زندگی کے تمام مسائل کو بھی بہت آسانی سے حل کیا ہے۔ اس کے نزدیک نکاح سادگی اور سہولت سے ہونا چاہیے۔ اسے مشکل اور دشوار بنانا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی بعض اصولی تعلیمات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱- اسلام اس بات کا شدت سے مخالف ہے کہ کسی بھی معاملہ میں ظلم و زیادتی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کے نزدیک کسی کی کم زوری اور مجبوری سے فائدہ اٹھانا اور اس کا استحصال کرنا سراسر ناجائز ہے۔ جہیز کے نام پر لڑکی والوں کا استحصال بھی اسی میں آتا ہے۔ اسلام اس کا کسی حال میں روادار نہیں ہے۔

۲- شادی، لڑکی والوں سے دولت سمیٹنے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بعض بلند مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔ وہی شادی کامیاب ہے جن سے ان مقاصد کی تکمیل ہو۔ ہوسِ زر میں ان مقاصد کو پس پشت ڈال دینا غلط اور ناپسندیدہ ہے۔

۳- مرد کو اللہ نے قوّام بنایا ہے۔ وہ اسی حیثیت سے عقدِ نکاح کرتا ہے۔ وہ اس عہد و پیمان کے ساتھ لڑکی کا ہاتھ پکڑتا ہے کہ وہ اس کے نان ونفقہ اور رہائش وغیرہ کا ذمے دار ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام عطا کیا ہو اس کے لیے یہ بات سخت توہین کی باعث ہے کہ وہ شادی سے چند دن یا چند لمحے پہلے لڑکی یا اس کے سرپرستوں کے سامنے جہیز کے نام پر دستِ سوال دراز کرے اور جب اپنی مراد پوری نہ ہو تو پھر کسی دوسری لڑکی کے در پر پہنچ جائے۔

۴- جہیز کے نہ ملنے یا کم ملنے پر عورت کے ساتھ بالعموم جو زیادتی ہوتی ہے

اس کا کوئی دینی اور اخلاقی جواز نہیں ہے۔ یہ اسلام کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ جہیز یا مال واسباب کے لیے عورت کو تنگ کرنے کی جگہ اسلام نے عورت کی دل جوئی کا حکم دیا ہے۔ 'مہر' اسی کی علامت ہے۔ مہر کی بہت سی حکمتیں ہیں۔ ایک حکمت یہ بھی ہے کہ عورت اپنے گھر اور خاندان سے چوں کہ جدا ہوتی ہے اس لیے مرد، مہر کی شکل میں خلوص ومحبت کا تحفہ پیش کرتا ہے اور اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اس کا دشمن نہیں مخلص، ہم درد اور غم خوار ہے۔ پھر جہیز کے لیے پریشان کرنا عورت کے ساتھ حسن سلوک کی اس تعلیم کے بھی خلاف ہے جو اسلام نے دی ہے۔

جس شخص کے سامنے یہ پاکیزہ اور مقدس تعلیمات ہوں اس کا وہ ذہن ہرگز نہیں ہوسکتا جو آج کے نوجوان کا ذہن ہے۔ وہ جہیز کے نام پر عورت اور اس کے اہلِ خاندان کے استحصال کی جگہ ان سے ہم دردی اور محبت کا رویہ اختیار کرے گا اور بہیمیت کی جگہ اپنے حسن سلوک سے شرافت اور انسانیت کا ثبوت فراہم کرے گا۔

اسلام کی اس تعلیم کا نتیجہ ہے کہ 'جہیز' کے مسئلے نے مسلم سماج میں دوسرے سماجوں کی طرح کبھی بھیانک شکل اختیار نہیں کی۔ لیکن اب آہستہ آہستہ اس کے بعض طبقات میں یہ مرض پھیلتا جا رہا ہے اور اس کی وجہ سے ایسی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں، جن سے مسلم معاشرہ بڑی حد تک محفوظ تھا۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ سماج میں اسلامی تعلیمات کو عام کیا جائے اور اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹنے کی دعوت دی جائے۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ جو لوگ جہیز کی خرابی کو محسوس کر رہے ہیں وہ ہمت کر کے اس کے لین دین کو ختم کریں۔ اس معاملہ میں لڑکی والے تو مظلوم ہیں۔ انھیں نصیحت کی نہیں ہم دردی کی ضرورت ہے۔ البتہ لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کے خلاف اقدام ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں جو بھی نقصان ہو اسے خدا کی رضا کے لیے انھیں برداشت کرنا چاہیے۔ جب تک آدمی ان مفادات کو نہ چھوڑے جو کسی غلط کام کی وجہ سے اسے حاصل ہو رہے ہیں اس کی اصلاح بھی نہیں کرسکتا۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے بعض باتوں کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے، تاکہ اس مسئلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح سامنے آجائے۔

۱- شادی کے بعد لڑکے اور لڑکی کو اپنا نیا گھر بسانا ہوتا ہے۔ اس میں لڑکے والے بھی ان کی مدد کرسکتے ہیں اور لڑکی والے بھی۔ اگر نیا جوڑا اس معاملے میں تعاون کا مستحق ہو تو تعاون کو پسندیدہ ہی کہا جائے گا۔ یہ تعاون پیسہ کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور ساز و سامان کی شکل میں بھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ چیزیں عاریتاً استعمال کے لیے دی جائیں۔ لیکن یہ نہ تو فرض اور واجب ہے کہ تعاون نہ کرنے والا فریق ملزم گردانا جائے اور نہ نکاح کی شرط کہ اس کے بغیر نکاح ہی نہ ہوتا ہو۔

۲- شادی کے موقعے پر دولھا اور دولھن کو اعزہ و اقارب اور احباب اور دوستوں کی طرف سے تحفے اور ہدیے دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اسے جواز ہی کی حد میں ہونا چاہیے۔ اسے ضروری سمجھنا یا اس کے نہ دینے پر برا ماننا اور شکوہ شکایت کا پیدا ہونا صحیح نہیں ہے۔ تحفہ اور ہدیہ خوش دلی سے ہوتا ہے ورنہ وہ تحفہ نہیں تاوان اور جرمانہ ہوگا۔

۳- شادی کے موقع پر لڑکی کو جو زیور یا سامان دیا جاتا ہے اس کے بارے میں یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ شوہر یا سسرال والوں کی ملکیت ہے۔ اس کی مالک اصلاً لڑکی ہوتی ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف نہیں کیا جاسکتا۔

۴- آخری بات یہ کہ اسلام نے نکاح کو آسان رکھا ہے۔ اس لیے سماج کی وہ ساری بندشیں جن سے اس میں دشواری پیدا ہو قابل مذمت ہیں۔ ان سے ایک مسلمان کو احتراز کرنا چاہیے۔

یہ ہے وہ اعتدال کی راہ جو اسلام نے دکھائی ہے۔ اس میں محبت اور ہم دردی ہے، حسن سلوک ہے، ظلم و زیادتی کی ممانعت ہے اور اس کے ساتھ انسان کے جذبات اور ضروریات کی بھرپور رعایت بھی ہے۔ اس پر عمل ہو تو جہیز کے جھگڑے ہی ختم نہیں ہوں گے، بلکہ پرسکون خاندانی زندگی بھی نصیب ہوگی۔

دورِ حاضر میں مسلمان عورت کے مسائل

معروف دینی ماہ نامہ 'ترجمان القرآن' لاہور کی طرف سے ایک سوال نامہ موصول ہوا تھا، جو آج کے دور میں ایک دین دار خاتون کے مسائل اور مشکلات، عورت کے ساتھ مسلم معاشرے کے رویے، تحریکاتِ اسلامی کی اصلاحی کوششیں، اسلامی ریاست میں عورت کی حیثیت جیسے سوالات پر مشتمل تھا۔ ذیل کا مضمون اسی کے جواب میں لکھا گیا۔

موجودہ دور میں دین دار عورت کے مسائل اور مشکلات

مغرب نے جو مسائل پیدا کیے ہیں ان میں بنیادی مسئلہ اس کے فلسفۂ حیات کا ہے، اس کا حملہ اتنا زبردست اور اس کا دباؤ اتنا شدید ہے کہ مسلمان عورت کو استقلال اور استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ قدم قدم پر محسوس کرتی ہے کہ یہ پورا فلسفہ اس کی راہ میں مزاحم ہی نہیں، بلکہ اسے ایک دوسری ہی سمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ اس میں خدا پر ایمان و یقین، اس کی عبادت و اطاعت، رسول کی رسالت، اس کی ہدایت اور رہ نمائی اور آخرت کی بازپرس کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ وہ دین کی ان بنیادی حقیقتوں کا انکار کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور ان سے آزاد ہوکر زندگی کی تعمیر چاہتا ہے۔ یہ ایک زبردست ذہنی کشمکش ہے جس سے مسلمان عورت دوچار ہے۔ (یہ کشمکش

مسلمان مرد کے لیے بھی ہے۔ یہاں زیرِ بحث مسلمان عورت کے مسائل ہیں۔ اس لیے صرف اسی کا ذکر ہے۔)

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمان عورت گھر اور خاندان کو اپنا اصل مرکزِ توجہ اور حقیقی دائرۂ کار سمجھتی ہے۔ مغربی تہذیب اسے اس مرکز سے ہٹانے کی بھرپور کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ وہ گھر میں گھس کر اس کے سکون پر حملہ آور ہو رہی ہے اور اسے بے یقینی اور اضطراب میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔ مغرب جن پہلوؤں سے اسلام پر اپنی یورش جاری رکھے ہوئے ہے ان میں اس کے نظامِ خاندان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ مختلف عنوانات سے یہ بات ذہن نشیں کرانا چاہتا ہے کہ اسلامی خاندان عورت کے لیے ایک قید خانہ سے کم نہیں ہے، اس کی بنیاد مرد کے اقتدار پر ہے۔ اس میں عورت کی حیثیت ایک محکوم سے زیادہ نہیں ہے، اس کے حقوق غیر محفوظ اور اس کی ذمے داریاں بے شمار ہیں۔ پردہ کے نام پر اس کی آزادانہ تگ و دو پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ وہ کھل کر کسی معاملہ میں کسی کے سامنے نہیں آ سکتی۔ وہ پیدائش سے لے کر شادی تک ماں باپ کی دست نگر اور شادی کے بعد شوہر کی باندی ہے۔ مرد اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے چار بیویاں رکھ سکتا ہے اور طلاق کے دو لفظ بول کر ان میں سے جسے چاہے گھر سے نکال سکتا ہے۔ اس کی معاش کا کوئی نظم نہیں ہے اور وہ مرد کے ہاتھ میں مجبور و محبوس ہے۔

اسلام کی تعلیم کی یہ بہت ہی غلط تعبیر ہے۔ دنیا کی کسی بھی صحیح اور معقول بات کو نامعقول اور بھیانک بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی طرح کی کوشش ہے۔ اس کوشش کو ناکام بنانا اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔

خاندانی نظام پر اس فکری یلغار یا لگاتار حملوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عورت اس نظام ہی سے متنفر ہو جائے، اسے ایک ظالمانہ نظام سمجھے اور اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔ وہ آگے بڑھ کر ماں باپ سے، شوہر سے اور پورے خاندان سے

بغاوت کردے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی بغاوت کے بعد خاندان اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا اور اسے شکست و ریخت سے کوئی طاقت بچا نہیں سکتی۔ خاندان معاشرہ کا بنیادی ادارہ ہے۔ اسلام آج بھی یہاں بڑی حد تک زندہ اور محفوظ ہے۔ اگر یہ ادارہ ختم ہوجائے تو اجتماعی زندگی کے دوسرے اداروں سے وہ آسانی سے ختم ہوجائے گا۔ مغربی تہذیب یہی چاہتی ہے۔

مغرب میں عورت اور مرد کی مساوات کا ایک خاص تصور پایا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر فطری تصور ہے۔ اسی وجہ سے خود مغرب میں اسے پوری طرح اپنایا نہیں جاسکا ہے۔ عورت اور مرد کی صلاحیتوں کا فرق اس میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن اس تصور کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ہر تنقید سے بالاتر ہے۔ چناں چہ اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت بھی مشکل ہی سے کی جاتی ہے۔

مساوات کے اس تصور کے تحت مسلمان عورت کو یہ باور کرانے کی مسلسل کوشش ہورہی ہے کہ خاندان ہی میں نہیں، اس سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام اسے مرد کے مساوی درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسے وہ حقوق حاصل نہیں ہیں جو بحیثیت ایک انسان کسی مہذب معاشرہ میں ملنے چاہئیں۔ اسے مرد سے کم تر سمجھا جاتا ہے، اس کی شہادت آدھی شہادت ہے، اس کی دیت نصف دیت ہے، وراثت میں اس کا حصہ آدھا ہے۔ ملازمت، تجارت اور صنعت وحرفت میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ حکم رانی کے منصب پر وہ کبھی فائز نہیں ہوسکتی۔ مسلمان عورت کی مظلومیت کی یہ داستان دورِ جدید کے طاقت ور ذرائع ابلاغ سے اس زور شور سے سنائی جارہی ہے کہ دل و دماغ کا اس سے متاثر و مرعوب ہونا تعجب خیز نہیں ہے، جب کہ اسلام کا موقف اتنی ہی قوت کے ساتھ سامنے نہیں آرہا ہے اور ماحول بھی اس کے مخالف ہے۔

مسلمان عورت عملی کشمکش میں بھی مبتلا ہے۔ ایک طرف اس کے خیالات زمانہ

کے خیالات سے متصادم، اس کے سوچنے کا انداز معاصر فکر سے مختلف، اس کے ذوق اور دلچسپی کا دائرہ آج کی دنیائے لہو ولعب سے جدا ہے۔ دوسری طرف اس کا صوم وصلوٰۃ اور عبادات کا پابند ہونا اور اخلاقی اقدار پر اس کا اصرار، موجودہ عریاں کلچر اور آرٹ سے اس کی دوری، شرم وحیا کو اس کا زینت سمجھنا، اس کا لباس اور اس کا حجاب یہ سب چیزیں آج کے ماحول میں اسے بالکل اجنبی بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ یوں محسوس کرتی ہے جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو اور دین واخلاق کی صاف ستھری فضا میں وہ سانس لینا چاہے تو بھی نہ لے پا رہی ہو۔ اگر اتفاق سے اور اب یہ محض اتفاق ہی نہیں رہا، بلکہ ایک عمومی واقعہ بن گیا ہے۔ ماں باپ، شوہر یا خاندان کے دوسرے افراد غیر اسلامی ذہن ومزاج کے ہوں تو مسلمان عورت کی کشمکش اپنے گھر ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کشمکش بڑی سخت ہوتی ہے۔ اپنے قریبی ماحول کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے اسے بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ حالات میں ایک مسلمان خاتون جن مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا ہے۔ آج علم محض چند طبعی یا فکری معلومات میں اضافے کا نام ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے طالب علم کو ادبی، سماجی اور سائنسی معلومات تو فراہم کرتے ہیں، لیکن ان معلومات کو صحیح رخ نہیں دے پاتے، اس لیے طالب علم کی ذہنی وفکری تربیت نہیں ہو پاتی اور معلومات کا یہ بوجھ کبھی کبھی دین سے انحراف کا سبب بن جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں سے باہر کی دنیا اخلاقی بگاڑ ہی میں اضافہ کرتی ہے۔ بسا اوقات گھر کا ماحول بھی اصلاح وتربیت میں معاون نہیں ہوتا۔

ان حالات میں اسلامی ذہن وفکر رکھنے والی خاتون جب دیکھتی ہے کہ نئی نسل، جس میں اس کی اولاد بھی شامل ہے، غیر اسلامی افکار کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے اور اسے وہ روک نہیں پا رہی ہے تو اسے دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی اس پریشانی اور فکرمندی کا تصور کرنا دشوار نہیں ہے۔

یہ تو بعض مسائل اور دشواریاں ہیں۔ مخالف ماحول میں اس طرح کی دشواریوں کا پیش آنا تعجب خیز نہیں ہے۔ ان کا پیش نہ آنا تعجب کا باعث ہوسکتا ہے۔ ان سے ہراساں ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان خاتون اپنے دین و ایمان، خدا سے تعلق اور استعانت اور حکمت و تدبیر سے ان پر قابو پاسکتی ہے۔ اگر وہ اس فیصلہ اور عزم و یقین کے ساتھ کھڑی ہو کہ حق پر قائم رہے گی اور غیر اسلامی ماحول کو بدلنے کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں گی انھیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرے گی تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اسے حاصل ہوگی، رکاوٹیں دور ہوں گی۔ ظلمتِ شب چھٹے گی اور کامیابی کی سحر طلوع ہوگی۔

مسلم معاشرہ میں عورت کی حیثیت

موجودہ مسلم معاشرہ میں (خاص طور پر برصغیر کے پس منظر میں) عورت کی حالت بڑی ابتر رہی ہے۔ وہ ان حقوق سے بڑی حد تک محروم تھی اور ہے جو اسلام نے اسے عطا کیے ہیں۔ دورِ جاہلیت کی طرح لڑکی کو ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش پر خوشی نہیں محسوس کی جاتی، بلکہ ماں باپ اور گھر کے لوگوں پر ایک طرح کی افسردگی چھاجاتی ہے، پیدائش کے بعد اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اس توجہ سے محروم ہوتی ہے جو لڑکوں کے سلسلہ میں دیکھی جاتی ہے۔ اس کی تعلیم صحیح معنی میں نہ قدیم ہوتی ہے اور نہ جدید۔ اس کی معلومات کی دنیا خاندان کے طور طریقوں اور رسوم و رواج تک محدود ہوتی ہے، اس کی واقفیت نہ تو قرآن و حدیث کی تعلیمات سے ہوتی ہے اور نہ جدید علوم سے، زندگی کے کسی شعبہ میں اسے وہ بصیرت حاصل نہیں ہوتی کہ دینی اور دنیوی نقطۂ نظر سے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرسکے، قومی اور بین الاقوامی معاملات سے وہ بے خبر ہوتی ہے، دنیا میں کیا تبدیلیاں آرہی ہیں، کیوں آرہی ہیں اور ان کے پیچھے کیا اسباب و عوامل ہیں ان کا اسے کوئی علم نہیں ہوتا، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا

کے بھلے برے سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں اس صورت حال میں کہیں کہیں تبدیلی ضرور آئی ہے اور ہماری خواتین نے علم کے میدان میں نمایاں ترقی کی ہے۔ لیکن ایک طویل عرصے سے وہ تعلیم میں اس قدر پیچھے رہی ہیں کہ اس کی تلافی کے لیے شاید ایک لمبی مدت درکار ہوگی۔

اب تعلیم سے ہٹ کر بعض دوسرے معاملات پر غور فرمائیے۔ شادی کے وقت مہر کی بڑی بڑی مقدار طے ہوتی ہے، لیکن اس کے ادا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی، شادی کے بعد اس کی ذمے داریاں تو بیان ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں وہ ذمے داریاں بھی شامل ہیں جس کا از روئے شرع کوئی جواز نہیں ہے۔ شریعت کا منشا یہ ہے کہ عورت پر خانگی امور اور اس کے نظم و نسق کا بوجھ (جس میں کھانا پکانا، صفائی ستھرائی وغیرہ جیسے کام بھی شامل ہیں) اس کی طاقت سے زیادہ نہ ڈالا جائے۔ اگر یہ بوجھ زیادہ ہو تو مرد اس میں تعاون کرے۔ لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ اس بوجھ کے ساتھ خاوند کی خدمت بھی اسے کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ خاوند کے بھائیوں، بہنوں اور دور و نزدیک کے رشتہ داروں کی خدمت بھی اس پر لازم سمجھی جاتی ہے۔ ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کی جاتی اور اس پر طرح طرح کی زیادتیاں ہونے لگتی ہیں۔ اس کی عمر کا بہترین حصہ ساس بہو کے جھگڑوں اور سسرال کے غلط سلوک کی نذر ہو جاتا ہے۔ ماحول کی سختی کی وجہ سے اس کی قوت و توانائی ضائع ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ خاندان اور سماج کے لیے کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے پاتی۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائداد میں اسے وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ بیوہ یا مطلقہ ہوجانے پر اس کا دوبارہ نکاح ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی پوری عمر بے شوہر کے گزر جاتی ہے۔ ان حالات میں مسلمان عورت کے اندر ایک طرح کی مایوسی کا پایا جانا فطری ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس کی کم زوری اور مجبوری کا استحصال ہو رہا ہے، اس کے دینی اور سماجی فرائض اور ذمے داریوں کا تو ہر طرف چرچا ہے اور ان کے پورے کیے جانے کا مطالبہ بھی شدت

سے ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے حقوق ادا کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ احساس عملاً اسے آہستہ آہستہ اسلام سے دور کر رہا ہے۔ اس کے اندر اسلام سے نظریاتی یا فکری بغاوت تو بالعموم نہیں ہے، لیکن اسلام سے جس قسم کا تعلق اور وابستگی ہونی چاہیے وہ کم زور ہوتی جارہی ہے۔ اسے اسلامی معاشرہ میں وہ کشش نظر نہیں آتی جو اس سے پوری قوت سے وابستہ رہنے اور اسے مستحکم بنانے کے لیے ضروری ہے۔

تحریکاتِ اسلامی کی اصلاحی کوششیں

اسلامی تحریکوں نے اس صورتِ حال کو بدلنے کی مختلف پہلوؤں سے جو کوشش کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں جہاں تک ان تحریکوں کے اثرات ہیں ایک طرف تو مسلمان عورت کو اس کے اسلامی حقوق مل رہے ہیں، دوسری طرف خود مسلمان خواتین کے ایک طبقہ میں دین کا صحیح شعور پیدا ہو رہا ہے۔ ان میں سے بعض اسلامی جذبات سے سرشار ہیں اور حالات کا مقابلہ کر رہی ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے اثرات بہت محدود ہیں۔ سماج میں اس سے کوئی بڑی محسوس تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی مسلمان عورت اسلام کی واضح تعلیمات سے متصادم اور مخالف ماحول میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کہ پورے معاشرہ کی فضا بدلے۔ عورت دین اور دنیا کے علم سے آراستہ ہو، اپنے حقوق اور فرائض کو پہچانے۔ اسلامی تعلیمات کی پابند ہو۔ اس کے جو حقوق مجروح ہو رہے ہیں انھیں اسلام کے بتائے ہوئے حدود کے اندر حاصل کرنے کی جدوجہد کرے۔ اس کے ساتھ اپنے فرائض سے غفلت نہ برتے، بلکہ خوش اسلوبی اور سلیقہ سے انھیں ادا کرنے کی کوشش کرے۔ دوسری طرف مرد کو بھی اپنے رویہّ پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ وہ خوش دِلی سے عورت کے حقوق ادا کرے، جس پہلو سے بھی اس پر زیادتی ہو رہی ہو اسے دور کرنے میں کوتاہی نہ کرے اور اسے بہتر اور باوقار اور پرسکون ماحول فراہم کرے۔

معاشرہ کی اصلاح اور اس کے اندر اسلامی فضا پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اسے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ انجام دینا ہوگا۔ عورت کے اندر بغاوت کا اور مرد کے اندر اسے دبانے اور کچلنے کا جذبہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ خاندان کا نظام درہم برہم ہوکر رہ جائے گا۔ دونوں طرف قانونی جنگ کی جگہ محبت اور الفت کی وہ فضا ہونی چاہیے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ اسی سے اسلامی معاشرہ کی تعمیر ممکن ہوگی۔

جب اسلام غالب ہوگا

اسلام اور غیر اسلام کی کشمکش کا یہ دور ختم ہونے کے بعد مسلمان عورت، یقین ہے کہ ایک نئی زندگی اور نئی توانائی کے ساتھ میدان عمل میں آئے گی۔ اس کے چند نمایاں پہلو یہ ہوں گے:

غیر اسلامی افکار و نظریات اس کے لیے اپنی کشش کھودیں گے۔ ان کے جھوٹے پروپیگنڈے اور کھوکھلے نعروں کی تاثیر ختم ہوجائے گی۔ مسلمان عورت اسلامی فکر کی علم بردار، اسلامی سیرت کی حامل اور اسلامی حدود و آداب کی پابند ہوگی۔ اس کی پوری زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے گی۔

وہ علم کی دولت سے آراستہ، دنیاوی مسائل سے واقف اور دینی بصیرت کی حامل ہوگی، اس وجہ سے اسے کسی فکری اضطراب میں مبتلا کرنا اور دین سے پھیرنا آسان نہ ہوگا۔

اسلام نے اسے جو حقوق دیے ہیں، چاہے ان کا تعلق عائلی زندگی سے ہو یا سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی سے، وہ ان سب سے بہرہ ور ہوگی اور اس احساس سے دوچار نہ ہوگی کہ اسلامی معاشرے میں بھی اسے ان حقوق کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسے وہ ان کا محافظ پائے گی۔ موجودہ دور کے پرفریب تصورِ مساوات کی جگہ حقیقی مساوات سے روشناس ہوگی۔

مسلمان عورت کو اپنے فرائض اور ذمے داریوں کا بھی احساس ہوگا۔ وہ خانگی ذمے داریوں کو حقیر نہیں سمجھے گی، بلکہ معاشرہ کی تعمیر میں خاندان کی جو اہمیت ہے اسے وہ اہمیت دے گی، اسے اسلام کا مضبوط قلعہ بنانے میں شوہر کی معاون ہوگی اور آنے والی نسل کو اسلامی سیرت وکردار میں ڈھالنے کی کوشش کرے گی۔

مسلمان عورت کا ملکی وملی مسائل سے مضبوط تعلق ہوگا۔ وہ ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لیے فکر مند ہوگی اور اس کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرے گی۔ اجتماعی زندگی میں موثر کردار ادا کرے گی، رائے مشورہ اور نقد و احتساب میں شریک ہوگی اور جہاں کوئی خامی دیکھے گی اس کی اصلاح کی کوشش کرے گی۔

اسلامی تحریکوں کے لیے بعض توجہ طلب پہلو

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تحریکوں میں مسلمان خواتین کا جو حصہ ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ حالاں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمے داری مرد اور عورت دونوں پر ڈالی گئی ہے۔ یہ اسلام کا دعوتی مقصد بھی ہے اور سیاسی بھی۔ اسلام جس معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اس کا اس وقت تک تصور نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ دونوں معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے میں نہ لگ جائیں۔ قرآن مجید اس پاک مقصد کے لیے دونوں کے باہم تعاون کو ضروری قرار دیتا ہے۔ یہی حقیقت سورۂ توبہ کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ	ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ

سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ (التوبة:۷۱)

ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔

دورِ اول کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اللہ کے دین کے قبول کرنے، اس کے لیے تکلیفیں برداشت کرنے اور ہجرت، جہاد اور اسلامی ریاست کے قیام کے مختلف مراحل میں وہ مردوں کے دوش بدوش رہی۔ یہی کردار آج مسلمان عورت کو ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کارِ دعوت کی اہمیت اس کے ذہن نشین کرائی جائے، اس راہ میں قربانی کا جذبہ اس کے اندر پیدا کیا جائے۔ اسے بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کا ایک بنیادی تقاضا امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے۔ اس کی تکمیل مرد اور عورت کے تعاون ہی سے ہوسکتی ہے۔ معروف کے مٹنے اور منکر کے پھیلنے پر جو بے چینی ایک دین دار مرد میں ہونی چاہیے وہی ایک دین دار عورت میں ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ شرعی حدود کے اندر اسے ان تمام کاموں میں عملاً شریک کیا جائے جو اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔[۱]

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ راقم کی کتاب 'مسلمان خواتین کی ذمے داریاں' ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

عورت اور معیشت

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (.I.P.S) پاکستان کا ایک علمی اور تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کی قیادت عالمی شہرت کے حامل ماہرِ معاشیات پروفیسر خورشید احمد کر رہے ہیں اور جناب خالد رحمٰن صاحب ان کے معاون اور دست راست ہیں۔ مجھے اپنے پاکستان کے سفر میں اس ادارہ کی دعوت پر ۲۵/مارچ ۲۰۰۵ء کو 'عورت اور معیشت' کے عنوان پر خطاب کا موقع ملا۔ منتخب مجمع تھا۔ سو سے زیادہ افراد شریک تھے۔ ان میں ایک تہائی تعداد تعلیم یافتہ خواتین کی تھی۔ خطاب کے بعد سوالات کا طویل سلسلہ رہا۔ بعض سوالات موضوع سے متعلق تھے۔ بعض دیگر سوالات بھی کیے گئے، لیکن ان کا تعلق بھی عورت ہی سے تھا۔ سوالات زیادہ تر خواتین کی طرف سے تھے۔ تقریر اور سوالات و جوابات کیسٹ سے نقل ہوئے ہیں۔ اب انھیں حذف و اضافہ کے بعد یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

خاندان ایک سماجی اور معاشرتی ادارہ ہے۔ ہر ادارہ ایک نظم کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے بغیر اسے چلایا نہیں جاسکتا، بلکہ اس کا وجود بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ خاندان کا ادارہ مرد اور عورت کے اشتراک اور تعاون سے چلتا ہے۔ اس کی صورت اسلام نے یہ بتائی ہے کہ خاندان کے داخلی نظم و استحکام کے لیے عورت کو فارغ کیا جائے اور اس کی معاشی ذمے داری مرد اٹھائے۔ اس میں عورت کا کھانا کپڑا، رہائش کا نظم اور دونوں صاحب حیثیت ہوں تو خادم کا انتظام شامل ہے۔ دوا علاج کی ذمے داری بھی مرد کی

ہونی چاہیے۔[1]

یہ ایک قانونی بحث ہے۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے اس کا تقاضا ہے کہ آدمی بیوی کے ساتھ بہتر سے بہتر رویہ اختیار کرے اور اس کی آسائش و راحت کا اپنی استطاعت کی حد تک خیال رکھے۔

اس میں شک نہیں کہ عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر اور خاندان ہی ہے اور اسے معاشی مصروفیت سے اسی لیے آزاد رکھا گیا ہے کہ وہ خاندان کی بقا اور ترقی پر اپنا وقت صرف کرسکے، لیکن بعض اوقات اسے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا کام کرنے کا حق ہی نہیں رکھتی یا یہ کہ اس کے لیے معاشی جدوجہد کے تمام راستے بند کردیے گئے ہیں۔ یہ ایک غلط خیال ہے۔ اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان عورت نے گھر اور خاندان کا حق ادا کرنے کے ساتھ دینی و دنیاوی خدمات بھی انجام دی ہیں اور حسبِ حال معاشی جدوجہد بھی کرتی رہی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جاسکتا ہے۔

۱- کبھی خاندان کی ضرورت ہوتی ہے کہ عورت معاش میں شوہر کا تعاون کرے۔ یہ صورت حال بالعموم محنت کش طبقہ میں دیکھی جاتی ہے کہ میاں بیوی دونوں کی سعی و جہد سے معاشی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ انفرادی طور پر اس طرح کی مجبوری کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ یا ہنر مند خاتون کو بھی لاحق ہوسکتی ہے۔اس صورت میں اگر وہ کوئی جائز ذریعۂ معاش اختیار کرتی ہے تو اس کا اسے حق ہوگا۔

۲- عورت کی آمدنی کے بعض متعین ذرائع ہیں۔ اسے شوہر کی طرف سے مہر ملتا ہے۔ وہ زیورات کی مالک ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام نے وراثت میں اس کا حق رکھا ہے۔ اس حق کے تحت امکان ہے کہ اسے نقد، زمین، دکان، مکان یا اور کوئی چیز مل جائے۔

---

[1] ہمارے فقہاء کے ہاں دوا علاج کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس زمانے میں بالعموم گھریلو نسخوں سے علاج ہوتا تھا اور اس پر کوئی خاص خرچ نہیں آتا تھا، لیکن آج یہ ایک مستقل خرچ ہے اس لیے اسے بھی مرد کی ذمے داری میں شامل ہونا چاہیے۔

ان سب چیزوں کو وہ کسی نفع بخش کاروبار میں لگا سکتی اور اپنی معیشت بہتر بنا سکتی ہے۔

۳- ایک زمانہ تھا کہ عورت پر گھر کے کام کاج اور نظم و نسق کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ اس میں خاوند اور بچوں کی خدمت کے علاوہ اناج صاف کرنا، چکی چلانا، کوٹنا پیسنا، کھانا پکانا، پانی بھرنا، برتن اور کپڑے دھونا اور گھر کی صفائی جیسے بہت سے مشکل اور محنت طلب کام شامل تھے۔ عورت اس میں مستقل مصروف رہتی تھی۔ موجودہ دور مشینی دور ہے۔ عورت جو کام انجام دیتی تھی ان میں سے بیشتر کام مشینوں کے ذریعہ انجام پانے لگے ہیں۔ اس وجہ سے کم از کم شہروں میں اس کی مصروفیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ بچے تین چار سال کی عمر میں نرسری بھیج دیے جاتے ہیں۔ اس طرح گھر پر ان کی دیکھ بھال اور نگہ داشت کا بار کم ہو رہا ہے۔ ان حالات میں خانگی ذمے داریاں ادا کرنے کے بعد عورت کو جو فاضل وقت مل رہا ہے اسے وہ منظّم کرے اور اپنی اور خاندان کی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے اسے استعمال کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۴- شادی کے بعد عورت ایک خاص عرصہ تک زیادہ مصروف ہوتی ہے۔ اس میں بچوں کی پیدائش کا سلسلہ رہتا ہے۔ ان کی پرورش، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ان کی کردار سازی جیسے فرائض اسے انجام دینے پڑتے ہیں۔ اسے اس کی زندگی کا مصروف ترین دور کہنا غلط نہ ہوگا۔ لیکن جب اس کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہونے لگتی ہے تو اس کی یہ ذمے داریاں کم ہونے لگتی ہیں۔ لیکن اس عمر میں اس کی صلاحیتیں اور قوتیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ وہ چاہے تو زیادہ توجہ سے معاشی سرگرمی جاری رکھ سکتی ہے۔

عورت اپنے حالات و ظروف اور قوت و صلاحیت کے لحاظ سے کوئی ہنر اور پیشہ اختیار کر سکتی ہے۔ تعلیم و تدریس کے میدان میں جا سکتی ہے۔ ملازمت کی راہیں بھی اس کے لیے بند نہیں ہیں۔ وہ تجارت، زراعت، صنعت اور انڈسٹری میں اپنا سرمایہ لگا سکتی اور حسب سہولت ان کی نگرانی کر سکتی ہے۔ اس طرح معیشت کی اور بھی مناسب صورتیں وہ اپنے لیے سوچ سکتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ عورت کا نان نفقہ شوہر کی ذمے داری ہے۔ اس کا ادا کرنا اس پر واجب ہے۔ عورت صاحب حیثیت ہے یا اس کا کوئی ذریعہ آمدنی ہے تو بھی شوہر کی یہ ذمے داری ساقط نہ ہوگی۔ وہ علی حالہٖ باقی رہے گی۔ عورت کی آمدنی اس کی اپنی ملکیت ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اس میں تصرف کرسکتی ہے۔ شوہر اگر نادار ہے اور وہ اس پر اور بچوں پر خرچ کرتی ہے تو یہ اس کا حسنِ سلوک ہوگا۔ قانونی ذمے داری نہ ہوگی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی مالی حالت کم زور تھی۔ ان کی بیوی زینبؓ ان پر خرچ کرتی تھیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچیں اور حضرت بلالؓ کے توسط سے دریافت کیا کہ کیا میں اپنے شوہر پر (اور جو یتیم بچے میری گود میں ہیں ان پر) خرچ کرسکتی ہوں؟ ایک انصاری خاتونؓ بھی یہی سوال لے کر حاضر ہوئی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا:

نعم لهما اجران اجر القرابة و اجر الصدقة.[۱]

ہاں، ان کے لیے دو اجر ہیں ایک قرابت کا اجر اور دوسرا صدقے کا اجر۔

عورت کی معیشت پر گفتگو کرتے وقت دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اس کے اقدامات غلط رُخ اختیار کرلیں گے۔

۱- اسلام نے زندگی کے مختلف شعبوں میں حلال وحرام کے حدود مقرر کیے ہیں۔ ان کی پابندی مرد اور عورت دونوں کو لازماً کرنی ہوگی۔ اسلام کے نزدیک صرف حلال ذریعۂ معیشت ہی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ حرام ذریعۂ معیشت اپنانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔

۲- اس نے جو نظام معاشرت دیا ہے اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اختلاطِ مرد وزن سے پاک ہے، اس لیے عورت کوئی ایسا ذریعۂ معیشت نہیں اختیار کرسکتی جس میں اجنبی مردوں کے ساتھ مل کر اسے کام کرنا پڑے۔ عفت وعصمت ایک

---

[۱] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الزوج والایتام فی الحجر۔ مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین والزوج والاولاد الخ

اہم اخلاقی قدر ہے۔ یہ عورت کے لیے سرمایۂ عزت و وقار ہے، اسلام چاہتا ہے کہ اس پر کوئی آنچ نہ آنے پائے اور عورت کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس میں اس کے پامال یا مجروح ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے۔

۳- خاندان سماج کا ایک اہم ادارہ ہے۔ نظام دین میں بھی اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مضبوط ہوگا تو اسلام کی مضبوطی اور استحکام کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ یہ سلامت نہ رہا یا کم زور پڑ گیا تو سوسائٹی میں اسلام کا باقی رہنا اور فروغ پانا ممکن نہ ہوگا۔ اسے مرد اور عورت مل کر چلاتے ہیں۔ اس میں ان کے حقوق و فرائض ہیں۔ ان میں اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی اہم ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔ خاندان میں ماں باپ، بھائی بہن اور دور و نزدیک کے رشتے داروں کے قانونی اور اخلاقی حقوق بھی ہیں اور خاندان کی ذمے داریوں میں ان کی شرکت بھی رہتی ہے۔ اس پورے عمل میں داخلی طور پر عورت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے لیے خاندان اس کا وقت اور صلاحیت چاہتا ہے۔ معاش کی اہمیت ہے لیکن عورت کی معاشی سرگرمی ایسی نہ ہو کہ نظام خاندان ہی درہم برہم ہوجائے، خاندانی ذمے داریاں پس پشت ڈال دی جائیں، تعلقات کی روح نکل جائے اور وہ بے جان ہوکر رہ جائیں۔ خاندان اس کے افراد کے لیے مرکز سکون اور معاشرہ کی صحت مند ترقی کا ضامن ہے۔ اس کا نقصان فرد اور معاشرہ دونوں ہی کا نقصان ہے۔ اسے نظر انداز کرکے عورت کا یا مرد اور عورت دونوں کا کوئی قدم اٹھانا صحیح نہ ہوگا۔

موضوع سے متعلق سوال و جواب

تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض سوالات کا تعلق عورت کی معیشت سے تھا اور بعض کا اس کے دوسرے اجتماعی پہلوؤں سے۔ پہلے معیشت سے متعلق سوالات اور ان کے جوابات پیش کیے جارہے ہیں۔

سوال: (سروس کے ساتھ نفقہ کا حق)

خواتین اپنی سروس یا دوسری مصروفیات کی وجہ سے گھر کی ذمے داریاں کما حقہ ادانہیں کر پاتیں۔ ایسی صورت میں کیا وہ نان نفقہ کی حق دار رہتی ہیں؟

جواب:

اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عورت شوہر کی اجازت سے کوئی مصروفیت اختیار کرے۔ اس کی وجہ سے اگر وہ گھر کی ذمے داریوں کے لیے کم وقت دے پاتی ہے تو اس پر اعتراض بے معنی ہے۔ اس صورت میں عورت کے نان نفقہ کا حق باقی رہے گا۔ دوسری صورت یہ کہ عورت شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی مصروفیت اختیار کرے۔ اس کی وجہ سے وہ گھر سے باہر وقت گزارے یا میکے جا کر بیٹھ جائے تو وہ نان نفقہ کی حق دار نہ ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ آپ چھٹی لے کر یا باضابطہ طریقہ سے کہیں جائیں تو آپ کا تنخواہ کا استحقاق برقرار رہے گا اور بغیر بتائے چلے جائیں تو ظاہر ہے کہ آپ اپنا استحقاق کھودیں گے۔

سوال: (جائز ملازمتیں)

ہمارے معاشرے میں وہ کون سی ملازمتیں ہیں جو اسلامی حدود کے اندر خواتین کے لیے درست قرار پاسکتی ہیں؟

جواب:

میرا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ ایک مسلمان عورت خود کرسکتی ہے کہ وہ کون سی سروس یا ملازمت ہے، جس میں حدودِ شریعت کی وہ پابند رہ سکتی ہے اور کہاں ان حدود کی پابندی اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جس سروس میں ان حدود کی پابندی نہ ہوسکے اس سے لازماً احتراز کرنا چاہیے۔

سوال: (ناجائز سروس کی مجبوری)

بعض اوقات ایسے حالات ہوتے ہیں، جیسے شوہر کی آمدنی کم ہے اور دوسرے

وسائل بھی نہیں ہیں تو مجبوراً ایسی سروس بھی قبول کرنی پڑتی ہے، جس میں احکام شریعت کی پابندی نہیں ہو پاتی۔ اس میں صحیح رویہ کیا ہوگا؟

جواب:

اس طرح کی مجبوریاں موجودہ تہذیب اور موجودہ نظامِ معیشت کی پیدا کردہ ہیں۔ اسلامی ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ ایسے حالات فراہم کرے کہ ہر فرد کو اسلامی حدود کے اندر کسبِ معاش کے مواقع حاصل ہوں اور اسے ان حدود کو توڑنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ اس کے لیے آپ کو کوشش کرنی ہوگی کہ آپ کا یہ ملک صحیح معنی میں اسلامی ریاست بن جائے۔ پھر آپ دیکھیں گی کہ جو خواتین پڑھی لکھی ہیں، جن کے پاس وقت ہے اور جو ملکی معیشت کو آگے بڑھا سکتی ہیں ان کے لیے متعین کام ہیں اور اسلامی حدود میں رہتے ہوئے ان کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ موجودہ حالات میں اگر کہیں آپ کو مجبوراً اسلامی حدود سے آگے بڑھنا پڑے تو اسے مجبوری ہی سمجھیں۔ اسے اصولی طور پر شرعی جواز حاصل نہ ہوگا۔

سوال: (نان نفقہ کی نوعیت)

حدیث میں مرد سے کہا گیا ہے کہ جو خود کھاؤ وہ بیوی کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہ بیوی کو پہناؤ، اس بنیاد پر بعض خواتین سمجھتی ہیں کہ کھانا پکانا اور کھلانا اور باورچی خانہ کے دوسرے کام ان کی ذمے داری میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے وہ یہ کام نہیں کریں گی۔ مرد کی ذمے داری ہے کہ وہ تیار کھانا فراہم کرے۔ کیا فقہاء کرام نے بھی اس طرح کی کوئی بات کہی ہے؟

جواب:

ہمارے فقہاء کے ہاں اس طرح کی قانونی بحثیں ملتی ہیں کہ امورِ خانہ داری کی انجام دہی عورت کی ذمے داری میں شامل ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے کہ حدیث میں یہ جو بات کہی گئی ہے کہ مرد جو کھائے وہی اپنی بیوی کو کھلائے اور جو پہنے وہی بیوی کو

پہنائے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پکا ہوا کھانا اسے فراہم کرے اور ریڈی میڈ سوٹ اسے پہنائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری بیوی کا معیار یا اسٹیٹس تم سے فروتر نہیں ہونا چاہیے۔ کم از کم ہندستان اور پاکستان میں تو ایسا نہیں ہوتا کہ عورت کا معیار شوہر کے معیار سے کم ہو، بلکہ مرد عموماً خواتین کو اپنے سے بہتر حالت میں رکھتے ہیں۔ بعض اوقات مزاجوں کی عدم مناسبت، قوتِ برداشت کی کمی، ناچاقی یا دوسرے اسباب کی بنا پر عورت کے ساتھ نامناسب سلوک ہونے لگتا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ بیوی، جب تک بیوی ہے اس کا حق ہے کہ آدمی کا جو معیار زندگی ہے وہ اس کا بھی معیار ہو۔ یہ نہ ہو کہ اسے اس کی ضروریات کے لیے خرچ نہ دیا جائے یا دیا جائے تو اپنے اور اس کے معیار سے کم ہو۔ آدمی خود تو اپنی ضرورتوں کے لیے موٹر استعمال کرے اور بیوی کے لیے رکشا کی سہولت بھی نہ ہو۔ اپنے لیے کئی ملازم ہوں اور بیوی کے لیے کوئی خادمہ نہ ہو۔ جہاں تک کھانا پکانے یا گھر کے کام کاج کا تعلق ہے زمانۂ رسالت میں بھی خواتین یہ خدمت انجام دیتی تھیں۔ آج بھی انجام دیتی ہیں۔ اگر کوئی خاتون اسے اپنی قانونی ذمے داری نہ سمجھے اور اس سے دست کش ہوجائے تو وہ شوہر سے بھی صرف قانونی حقوق ہی کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ اسے اس حسنِ سلوک کی توقع نہیں کرنی چاہیے، جس سے وہ زندگی بھر بہرہ ور ہوتی رہتی ہے۔

سوال: (عورت کی ملازمت کے لیے نئے قواعد کی ضرورت)

آپ نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ عورت کسی دور میں معیشت کے لیے زیادہ کام نہیں کرسکتی تو دوسرے دور میں کرسکتی ہے۔ لیکن اگر اسے معاشی جدوجہد میں آنا ہے تو اسے شروع سے اس کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم پیشہ ورانہ ہو۔ ورنہ وہ بعد میں اس میدان میں کیسے داخل ہوگی؟

جواب:

یہ سوال بڑا اہم اور غور وفکر کا طالب ہے۔ عورت اگر پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرتی

ہے تو اسے اس کا حق ہے۔ اس پر پابندی لگانا درست نہ ہوگا۔ خاندان کی ذمے داریاں ادا کرنے کے بعد وہ شوہر کی اجازت سے کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرنا چاہتی ہے یا عمر کے ایک مرحلہ میں وہ اس کے لیے زیادہ وقت دینے کے موقف میں ہے تو اسے اس کے مواقع فراہم ہونے چاہئیں۔اس کے لیے مناسب تدابیر سوچی جانی چاہیے۔ اسی ذیل میں اس کی ملازمت کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔ اس وقت جو ضابطے اور قوانین موجود ہیں ان میں زیادہ تر مردوں کی سہولتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مردوں کے لیے جو اوقاتِ کار ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ خواتین کے لیے موزوں نہ ہوں۔ مردوں کے تقرر (Appointment) اور سبک دوشی (Retirement) کے جو قواعد ہیں خواتین کے لیے ان میں تبدیلی لانی پڑے۔ چالیس برس کی عمر میں بھی اگر عورت ملازمت شروع کرنا چاہے تو اسے اس کے مواقع حاصل ہوں۔ اور اسے سبک دوش بھی ساٹھ کے بعد کیا جائے۔ اس کے ساتھ اس کی قوت کار اور صحت و توانائی کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ اس پہلو سے ہم سب کو تو غور کرنا ہی چاہیے، لیکن اصلاً یہ ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لے اور خواتین کی خدمات کے لیے کوئی نیا نقشۂ کار مرتب کرے۔

بعض دیگر سوالات

سوال: (چادر اور چار دیواری)

ہمارے ہاں ایک وقت وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کے حوالہ سے چادر اور چار دیواری کی ٹرم (Term) استعمال کی گئی۔ اس کے خلاف خواتین کی آزادی (Woman Liberty) کی نام نہاد تنظیموں نے خوب شور مچایا اور اسے عورت کی آزادی کے منافی قرار دیا۔ اس مسئلہ میں ہم اسلام کا نقطۂ نظر جاننا چاہیں گے۔

جواب:

وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (اپنے گھروں میں سکون سے ٹکی رہو) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت گھر کے اندر ہی بند رہے اور گھر سے باہر نہ نکلے، اس میں جس بات کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ عورت اس طرح گھر نہ چھوڑ بیٹھے کہ اس کا نظام ہی ابتر ہوکر رہ جائے۔ عہدِ رسالت میں خواتین مسجد آیا کرتی تھیں، بازار میں بھی ان کی آمد و رفت رہتی تھی، کھیتی باڑی اور بعض دوسرے کاموں کے لیے گھر سے نکلتی تھیں۔ حج اور عمرے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ کسی نے اس پر نکیر نہیں کی۔ بلکہ حج تو استطاعت کی شرط کے ساتھ مرد کی طرح عورت پر بھی فرض ہوجاتا ہے۔ اسلام نے گھر کا داخلی نظم عورت کے سپرد کیا ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ گھر کو سکون، حفاظت اور راحت کا ذریعہ بنائے اور ایسا طرزِ عمل نہ اختیار کرے جس سے معلوم ہو کہ اس کا مرکزِ توجہ گھر نہیں بلکہ بازار، دفتر یا کارخانہ ہے۔ اس کے بعد اگر وہ کسی دینی یا دنیوی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلتی ہے تو غلط نہیں ہے۔ اسے 'وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ' کی خلاف ورزی نہیں کہا جائے گا۔

سوال: (مرد کی قوّامیت)

قرآن مجید میں اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ (مرد حاکم ہیں) کہا گیا ہے۔ اس کے تحت بیوی کے نان نفقہ کی ذمے داری مرد پر ڈالی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک خاوند جو بے روزگار ہے اور بیوی کا معاشی بار نہیں اٹھا رہا ہے۔ یا وہ جسمانی طور پر معذور ہے اور اسے جسمانی تحفظ (Physical Protection) نہیں دے سکتا۔ کیا پھر بھی وہ قوّام ہی ہوگا؟

جواب:

آپ اس سے بھی زیادہ بھیانک مثال پیش کرسکتی ہیں۔ ایک آدمی نابینا ہے یا اپاہج اور معذور ہے۔ خود تعاون اور مدد کا محتاج ہے۔ عورت اس کی خدمت کرتی اور اس کے اخراجات برداشت کرتی ہے تو کیا اس صورت میں بھی مرد کی حیثیت قوّام ہی کی ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے بہ حیثیت نوع مرد کو قوام کہا ہے۔ اس کی دو

وجہیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت اور برتری عطا کی ہے۔ یہ برتری جسمانی، ذہنی اور عملی تینوں پہلوؤں سے یا ان میں سے ایک یا دو پہلو سے ہوسکتی ہے۔ اسی برتری کی وجہ سے اسلام نے عورت کے مقابلہ میں مرد پر سیاسی، سماجی اور معاشی ذمے داریاں بھی زیادہ ڈالی ہیں۔ مرد کے قوّام ہونے کی دوسری وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عورت پر اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ یہ ایک عمومی بات ہے۔ استثنائی مثالیں ہر دور میں رہی ہیں۔ آج بھی موجود ہیں کہ ایک عورت ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مرد سے بہتر ہے اور اس کی معاشی حیثیت بھی مستحکم ہے اور وہ شوہر پر خرچ بھی کر رہی ہے۔ اس کے باوجود مرد کے قوّام ہونے کی حیثیت ختم نہیں ہوجائے گی۔ ورنہ مرد اگر اپنے مرد ہونے کی وجہ سے اور عورت اپنی معاشی حیثیت کی وجہ سے باہم ٹکرانے لگیں تو گھر کا نظام درہم برہم ہوکر رہ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید نے مرد کو قوّام کہنے کے ساتھ نیک بیوی کی تعریف کی ہے کہ وہ شوہر کے احکام کی اطاعت کرتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اپنی عزت و ناموس اور شوہر کے مال و اسباب، اس کے اندرونی معاملات اور رازوں کی حفاظت کرتی ہے۔ (النساء: ۳۴) اس لیے قرآن وحدیث کا منشا یہ ہے کہ عورت ہر حال میں مرد کو قوام سمجھے، اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے اور اس کے ساتھ ادب و احترام کا رویہ اختیار کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے نیک بیوی کی یہ تعریف فرمائی ہے کہ شوہر اسے دیکھے تو خوش کردے، کوئی حکم دے تو اطاعت کرے اور اپنے نفس اور اس کے مال میں کوئی ایسا رویہ نہ اختیار کرے جو اسے ناگوار ہو۔[1]

سوال: (طلاق کے بعد نفقہ)

بعض اوقات اس طرح کی صورت حال سامنے آتی ہے کہ ایک شخص کو معاشی طور پر مستحکم کرنے میں اس کی بیوی اس کا ساتھ دیتی ہے اور وہ اس کے تعاون کی وجہ سے کسی اچھے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر کسی چھوٹے موٹے اختلاف کی بنا پر ان میں

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء وما لکل واحد من الحقوق، بحوالہ نسائی و بیہقی

علاحدگی ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد عورت کے تمام حقوق ختم ہوجاتے ہیں۔ اس کا کیا جواز ہے؟ اس طرح کی خواتین کے نان نفقہ کا کون ذمے دار ہوگا؟

بعض لوگ بڑی آسانی سے اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس عورت کا باپ اس کے نان نفقہ کا ذمے دار ہوگا۔ لیکن عقلی لحاظ سے یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک عورت نے شادی کے چالیس پچاس برس جو اس کی زندگی کے بہترین ایام تھے، شوہر کے ساتھ گزارے، مثبت طریقے سے اپنے فرائض ادا کیے، اچھا تعاون (Contribute) کیا، اب وہ اچانک باپ کے گھر آجائے۔ ضعیف العمر باپ پر بیٹی کے نان نفقہ کی ذمے داری ڈالنا کیا خلاف عقل نہیں ہے؟

جواب:

جو صورت آپ نے بیان کی ہے اس طرح کی بعض اور صورتیں بھی بیان کی جاسکتی ہیں، جس میں عورت کے نان نفقہ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جیسے جو بچی یتیم ہے اس کے نان نفقہ، تعلیم و تربیت اور شادی کا ذمے دار کون ہوگا؟ اسی طرح جس عورت کو شوہر طلاق دے یا اس کا انتقال ہوجائے تو اس کے مستقبل کا کیا ہوگا؟ جب کہ یہ واقعات عین جوانی میں بھی پیش آسکتے ہیں اور ادھیڑ پن اور بڑی عمر میں بھی ان سے سابقہ پڑسکتا ہے۔ اس معاملہ میں شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ جو عورت اپنی معاش کا بوجھ خود نہ اٹھا سکے اس کی ذمے داری اس کے قریب ترین مرد رشتہ دار پر عائد ہوگی ___ البتہ بیوی اگر خوش حال ہو تو بھی مرد پر اس کا نفقہ واجب ہے ___ یتیم بچی کا ذمے دار اس کا قریب ترین وارث ہوگا۔ جیسے دادا، بھائی، چچا وغیرہ۔ اسی طرح کسی جوان عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا یا اسے طلاق ہوگئی اور وہ اپنے مصارف کی تکمیل کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتی ہے تو وہ باپ کے پاس ان تمام حقوق کے ساتھ آجائے گی جو شادی سے پہلے اسے حاصل تھے۔ بڑی عمر کی عورت اس صورت حال سے دوچار ہو تو اس کی اولاد اس کے اخراجات کی ذمے دار ہوگی۔ اس طرح شریعت میں نفقات کا ایک سسٹم ہے اس کے تحت یہ

مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم شریعت کی پابندی نہ کریں اور مسائل کو ناقابل حل سمجھ بیٹھیں۔ اب آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی مثالیں پیش کریں کہ ایک عورت کا نہ باپ ہے، نہ بیٹا ہے، نہ بھائی ہے، نہ چچا ہے اور ہے تو اس کا معاشی بوجھ برداشت کرنے کے موقف میں نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اسلام نے ریاست کی یہ ذمے داری قرار دی ہے کہ وہ اس کا مسئلہ حل کرے۔ اگر وہ اس سے غفلت برت رہی ہے تو اپنا فرض نہیں ادا کر رہی ہے۔ جو ریاست کسی ایسی عورت کی کفالت نہ کرے جو بے یار و مددگار ہے اور جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے تو اس کا وجود بے معنی ہے۔ درحقیقت ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست میں کسی ایسی بے کس و بے بس عورت کا تصور مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے جس کا کوئی کفیل نہ ہو۔

سوال: (مطلقہ کا تاحیات نفقہ)

کبھی کبھی یہ تجویز سامنے آتی ہے کہ جو شخص طلاق دے اس پر جب تک مطلقہ زندہ ہے اس کا نفقہ لازم کر دیا جائے۔ اس طرح ایک تو طلاق دینا آسان نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ مطلقہ کے نفقہ کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو سکے گا۔ اس ذیل میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:

یہ تجویز شریعت کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ شریعت نے طلاق کے بعد صرف عدت تک کا نفقہ لازم کیا ہے۔ شریعت نے جو چیز لازم نہیں کی ہے اسے ہم شریعت کے نام پر کس طرح لازم کر سکتے ہیں؟ دوسری بات یہ کہ یہ تجویز بہ ظاہر عورت کے حق میں ہے اور اس کے لیے مفید معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایک شخص اپنی حماقت یا بیوی کی کسی کم زوری کی وجہ سے اس سے علاحدگی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اگر آپ اس سے کہیں کہ طلاق دوگے تو یاد رکھو مطلقہ کو تاحیات نفقہ دینا ہوگا، سوچیے پھر وہ طلاق کیوں دے گا؟ وہ نہ تو بیوی کو بیوی کی طرح رکھے گا اور نہ اسے

طلاق دے گا کہ وہ آزادی سے اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکے۔ اسے لٹکائے رکھنے ہی میں اپنا فائدہ سمجھے گا۔ بعض اوقات عورت خود ہی اپنے غلط رو شوہر سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس صورت میں طلاق سے اس کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ اس پہلو سے طلاق کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنا عورت کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ مجبوراً عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور عدالت کی طویل کارروائی کے بعد اپنے شوہر سے نجات حاصل کر سکے گی۔

سوال: (عورت ہی کے لیے حجاب کی پابندی کیوں؟)

عورت کو پردے کا حکم ہے اور مرد بغیر پردے کے رہتا ہے۔ کیا یہ قرینِ انصاف ہے؟ کیا یہ مساوات مرد و زن کے تصور کے خلاف نہیں ہے؟ کیا اس سے عدل و انصاف کے تقاضے مجروح نہیں ہوتے؟ انسان کی عقل کہتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو برابر کی سطح پر ہونا چاہیے۔ آخر عورت کے پردے کے لیے کیا وجہ جواز ہے؟

جواب:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فطرت نے مرد اور عورت کے درمیان زبردست جنسی کشش رکھی ہے۔ ان کے باہم بے حجاب رہنے اور بے تکلف میل جول سے جنسی جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور وہ جنسی آوارگی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ تاریخ کا تجربہ اور حال کا مشاہدہ ہے کہ بے حجابی نے زنا اور بدکاری کو عام کیا ہے اور ردائے عفت و عصمت تار تار ہوئی ہے۔ حجاب اسی سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ حجاب میں مرد رہے یا عورت۔ اسلام نے عورت کو حجاب کا حکم دیا ہے۔ یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ مرد کو اس کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا کہ اگر وہ حجاب میں چلا جائے تو کارخانۂ حیات درہم برہم ہو جائے۔ مرد کے ذمے معاشی دوڑ دھوپ ہے، اس پر اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت کی ذمے داری ہے۔ اس کے لیے اسے بعض اوقات اتنے سخت اور محنت طلب کام کرنے پڑتے ہیں جو عورت کی

نازک فطرت اور مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے۔ ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے مرد کو حجاب کا پابند بنا دیا جائے اور عورت کو آزاد رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرد گھر میں بیٹھا رہے اور عورت اپنی اور خاندان کی معاشی ذمے داری برداشت کرے۔ عورت اس کی متحمّل نہیں ہوسکتی۔

سوال: (اختلاط مرد و زن)

آج کل مرد و زن کا اختلاط مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ کیا سب ہی شکلیں یکساں ممنوع ہیں؟ ایک مجلس میں مرد اور خواتین کی الگ الگ نشستیں ہوں، جیسا کہ آج کی نشست ہے، اسے بھی بعض حلقے ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب:

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اسلام مرد و زن کے اختلاط کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ یہ اختلاط جتنا زیادہ ہوگا ممانعت بھی اتنی ہی شدید ہوگی۔ اختلاط کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک صورت یہ کہ کسی مجلس میں مرد و خواتین کی ملی جلی نشستیں ہیں، آپس میں ہنسی مذاق ہو رہا ہے، انھیں ایک دوسرے سے قریب اور بے تکلف ہونے کے مواقع حاصل ہیں اور وہ ان مواقع کو کام میں لا رہے ہیں تو یہ اختلاط ناجائز اور حرام ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں آدمی کے غلط رخ پر جانے کے کافی امکانات ہیں۔ دوسری صورت کلاس روم کی ہے۔ فرض کیجیے کلاس میں طلبا کی تعداد پچاس (۵۰) ہے۔ اس میں پچیس (۲۵) لڑکے اور پچیس (۲۵) لڑکیاں ہیں۔ دونوں کے لیے علیٰحدہ نشستوں کا انتظام ہے تو اس میں گوکہ دونوں ایک ہی مجلس میں ہیں، لیکن اختلاط نہیں ہے۔ اس میں بہ ظاہر کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں خواتین مسجد اور عید گاہ میں آتی تھیں لیکن ان کی صفیں الگ ہوتیں۔ وہ مردوں کے ساتھ نماز ادا کرتیں اور آپؐ کے مواعظ سے فائدہ اٹھاتیں۔ بازار میں مرد اور عورت ساتھ چلتے ہیں، لیکن اس میں بے تکلفی کے مواقع نہیں ہوتے۔ اس لیے اسے ضرورتاً گوارا کیا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ عمر کے فرق کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ سورۂ نور میں لباس کے معاملہ میں بڑی عمر کی خواتین کے ساتھ رعایت کی گئی ہے (النور:٦٠)۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اختلاط کے معاملہ میں اسلام ایک جوان عورت سے جس احتیاط کا مطالبہ کرتا ہے، سن رسیدہ خاتون سے اس کا یہ مطالبہ نہیں ہے۔

سوال: (مساجد میں خواتین کی حاضری)

رسول اللہ ﷺ کے دور میں خواتین مسجد جایا کرتی تھیں، لیکن ہمارے علماء مساجد میں خواتین کی آمد کو فساد کا سبب قرار دیتے ہیں اور اس کا فقہی حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ خواتین اس وعظ و نصیحت سے محروم رہتی ہیں جس کا مساجد میں اہتمام ہوتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بازار میں خواتین کی آمد و رفت رہتی ہے اور وہ بے تکلف گھومتی پھرتی ہیں۔ اس کی مخالفت نہیں کی جاتی، مساجد میں جانے سے انھیں باز رکھا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں صحیح رویہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب:

رسول اللہ ﷺ کے دور مسعود میں، اس میں شک نہیں خواتین مسجد جایا کرتی تھیں۔ ان کے لیے الگ سے انتظام بھی تھا۔ اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ عورت کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ بھی ہدایت فرمائی کہ خواتین رات کے اوقات میں مسجد جائیں، دن میں نہ جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواتین کے لیے مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا فرض یا واجب یا باعث فضیلت نہیں ہے، بلکہ حالات کے لحاظ سے اس کی حیثیت جواز کی ہے[1] علماء نے عورتوں کے مسجد جانے کی حوصلہ افزائی نہیں کی یا اس کی مخالفت کی تو اس کی وجہ موجودہ فساد زدہ ماحول اور اخلاقی بگاڑ ہے۔

---

[1] اس کی مزید وضاحت اسی کتاب میں ایک اور سوال کے جواب میں کی گئی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ خواتین کو مسجد میں آنے سے منع کیا جاتا ہے، لیکن وہ بازار میں گھومتی پھرتی ہیں اس پر نکیر نہیں کی جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسجد اور بازار میں فرق ہے۔ مسجد عبادت گاہ اور انتہائی تقدس اور احترام کی جگہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر بھی پاک صاف ہوکر محض اللہ کی عبادت کے لیے وہاں پہنچے۔ اس کا دل و دماغ ذہنی آلائشوں اور سفلی جذبات سے پاک ہو۔ موجودہ حالات میں خواتین کی بہ کثرت آمد و رفت سے اس فضا کا باقی رہنا دشوار ہے۔ بازار کا معاملہ اس سے بہت مختلف ہے۔ عورتیں عام طور پر روز مرہ کی خریداری اور گھریلو ضروریات کے سلسلے میں بازار جاتی ہیں۔ بازار مادی چیزوں کی خرید و فروخت کی جگہ ہے۔ اس کے سلسلہ میں مسجد کی طرح احترام کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ عورتوں کو یہ اجازت ضرورت کے تحت دی گئی ہے۔ اگر وہ بغیر کسی ضرورت کے محض سیر سپاٹے یا تفریح کے لیے بازار میں گھومتی ہیں تو یہ شرعاً نا درست ہے۔ اس کی اصلاح کی کوشش ہونی چاہیے۔ رسول اللہؐ کی ہدایت ہے کہ عورت بے ضرورت گھر سے باہر نہ نکلے، نکلے تو بن سنور کر نہ نکلے، لباس شوخ نہ ہو بلکہ سادہ ہو، تیز خوشبو نہ استعمال کرے، راستہ میں بھیڑ بھاڑ سے بچے اور کنارے کنارے چلے۔ اس طرح کی اور بھی ہدایات ہیں، جن کی پاس داری ایک مسلمان عورت کو بہر حال کرنی چاہیے، ورنہ وہ شریعت کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوگی۔

اب رہا یہ سوال کہ مساجد وعظ و نصیحت کا بھی مرکز ہیں۔ خواتین اگر مسجد نہ آئیں تو اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ خواتین کو اس کے مواقع ضرور ملنے چاہئیں اور ایسا نظم ضرور ہونا چاہیے کہ وہ مساجد میں ہونے والے درس و تذکیر اور خطابات سے استفادہ کرسکیں۔ خاص طور پر جمعہ اور عیدین میں ان کی شرکت کا نظم ہونا چاہیے، اس سے ان کی دینی معلومات میں اضافہ ہوگا اور ان میں دینی جذبہ ابھرے گا۔ حدیث میں خواتین کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ عیدگاہ پہنچیں اور نماز میں شریک ہوں۔

سوال: (مملکت کی سربراہی)

کہا جاتا ہے کہ عورت کسی اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ صحیح ہے تو مولانا مودودیؒ نے مادرِ ملت فاطمہ جناح کے بارے میں جو رائے اختیار کی اسے کیا سمجھا جائے؟

جواب:

رسول اللہ ﷺ نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ ”وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی، جس کی سربراہ کوئی عورت ہو۔“ اس لیے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اس پر اس کی ذمے داری نہیں ڈالی جاسکتی۔[1]

میرا خیال ہے کہ مولانا مودودیؒ نے فاطمہ جناح کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا وہ ایک اضطراری فیصلہ تھا۔ صدر ایوب خاں ڈکٹیٹر تھے۔ ملک کے تمام اختیارات ان کے ہاتھ میں تھے اور نظامِ حکومت میں تبدیلی کی جمہوری راہیں وہ بند کر دینا چاہتے تھے۔ یہ سراسر غیر اسلامی اور غیر جمہوری عمل تھا۔ اس سے نجات پانے، عوام کے جمہوری حقوق کو بحال کرنے اور ملک میں اسلامی نظام کی راہ ہموار کرنے کے لیے مولانا مودودیؒ نے فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔ ملک کو سیاسی گرداب سے نکالنے کے لیے یہ ایک عارضی فیصلہ تھا۔ شریعت کا کوئی مستقل ضابطہ یا قانون نہ تھا۔

سوال: (عورت اور منصبِ قضا)

کیا عورت قاضی یا جج ہوسکتی ہے؟ کیا حضور ﷺ کے زمانے میں عورت قاضی یا جج رہی ہے یا یہ مسئلہ اجتہادی ہے؟

جواب:

رسول اللہ ﷺ خود قاضی تھے۔ یہ آپ کے منصب رسالت کا ایک لازمی جزو تھا۔ تمام فیصلے آپ خود فرماتے اور آپ کا فیصلہ آخری ہوتا۔ آپ کے مقرر کردہ عمّال اور

---

[1] مزید تفصیل ایک اور سوال کے جواب میں اسی کتاب میں آرہی ہے۔

گورنر آپ کے نائب کی حیثیت سے معاملات کے فیصلہ کیا کرتے تھے۔ ان میں کوئی خاتون نہیں تھیں۔ البتہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے دور میں جو اصحاب احکامِ شریعت بیان کرتے یا فتویٰ دیتے ان میں خواتین بھی شامل تھیں۔ ان میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کا نام بہت نمایاں ہے۔ فقہائے کرام نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ عورت قاضی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ بعض علماء اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ احناف کی رائے یہ ہے کہ حدود و قصاص کے علاوہ دیگر امور میں اس کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔ جن امور میں اس کی شہادت قبول کی جاتی ہے ان میں وہ فیصلہ بھی کرسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض پابندیوں کے ساتھ وہ قاضی یا جج ہوسکتی ہے۔ اس پر مزید غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سوال: (خواتین کے لیے کوٹا سسٹم)

خواتین تعلیمی، معاشی اور سیاسی طور پر مردوں سے کافی پیچھے ہیں۔ انھیں آگے بڑھانے کے لیے کوٹا سسٹم کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ اس کے تحت ہر شعبہ میں خواتین کے لیے تیس (۳۰) فیصد یا اس سے زیادہ سیٹیں محفوظ ہوں گی۔ جب مرد اور خواتین ایک سطح پر آجائیں گے تو یہ سسٹم ختم کر دیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اس کے اثرات خاندان اور سماج پر کیا پڑیں گے؟

جواب:

اگر ریزرویشن یا کوٹا سسٹم کے ذریعے عورت کے مسائل حل ہوں اور اسے سماجی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے اوپر اٹھایا جاسکے تو اس کی مخالفت نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس کے بعض پہلو غور طلب ہیں۔ یہاں صرف ملازمت کے پہلو سے دو ایک باتوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

آپ کے ہاں مردوں کے لیے روزگار کی صورتِ حال کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ روزگار کی تلاش میں لوگ بیرونِ ملک مسلسل جا رہے ہیں۔ اگر آپ تیس فی صد یا

پچاس فی صد ملازمتیں خواتین کے لیے مخصوص کردیں تو اتنی ہی تعداد میں کام کے قابل مرد مزید بے کار ہوجائیں گے۔ اگر اس وقت چالیس فی صد مرد بے کار ہیں تو اس وقت ان کی تعداد ستّر فی صد ہوجائے گی۔ آپ ان کے لیے اتنے نئے مواقع نہیں فراہم کرسکتے کہ یہ تعداد کم ہوجائے۔

کوٹا سسٹم کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں بعض اوقات باصلاحیت افراد کو نظر انداز کر کے کم صلاحیت افراد کے ذریعے کوٹا پورا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ریاست کے حق میں مفید نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ معاشی لحاظ سے ضرورت مند خواتین کو روزگار فراہم کرے، لیکن اگر وہ چالیس یا پچاس فی صد ملازمتیں ان کے لیے مخصوص کردے تو خاندان کے نظام پر اس کے منفی اثرات یقیناً پڑیں گے۔ اسے صحیح شکل میں باقی رکھنا ممکن نہ ہوگا۔

بہرحال یہ ایک مشکل مسئلہ ہے .I.P.S جیسے اداروں کو اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر کوئی لائحۂ عمل ملک وملت کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

بعض فقہی احکام

مسجد میں عورت کی نماز باجماعت میں شرکت

دو تین سال قبل مساجد میں عورتوں کی نماز سے متعلق اخبارات میں ایک طویل بحث چلی تھی۔ اب بھی یہ موضوع کبھی کبھی چھڑتا رہتا ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے جب یہ بات کہی گئی کہ عورتیں نماز کے لیے مساجد میں جاسکتی ہیں تو اسے میڈیا میں اس طرح پیش کیا گیا کہ یہ ایک انقلابی رائے ہے۔ اور مسلمانوں کے ذہن میں تبدیلی کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسی زمانے میں ایک اردو اخبار نے بعض سوالات کیے تھے۔ یہ سوالات اور ان کا جو جواب دیا گیا اسے کسی قدر حذف و اضافہ کے ساتھ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

سوال:

(۱) خواتین کا مسجد میں آکر باجماعت نماز ادا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) دیگر مسلم ممالک میں (جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں) خواتین مسجد میں نماز ادا کرتی ہیں تو ہندستان میں اس پر واویلا کیوں ہے؟

(۳) اسلام میں بہت سے کاموں کی اجازت ناپسندیدگی یا سخت شرائط کے ساتھ دی گئی ہے (تین طلاق اور ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی وغیرہ) لیکن انھیں آج بھی ناجائز یا حرام قرار نہیں دیا جاتا تو پھر خواتین کے مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کو پردہ کی شرائط کی پابندی کی تلقین کے بجائے ناجائز کہنا کیوں کر درست ہے؟

(۴) خواتین کے مسجد میں نماز پڑھنے کی پابندی کو حضرت عمرؓ سے منسوب کیا جا رہا ہے، جب کہ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے یہ واقعہ بھی منقول ہے کہ حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت بلالؓ نے جب یہ کہا تھا کہ "اللہ کی قسم ہم اپنی عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے" تو یہ سن کر حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ پر بہت ناراض ہوئے تھے اور کہا تھا کہ میں تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان بیان کرتا ہوں کہ "انھیں اجازت دو" اور تو کہتا ہے کہ ہم اجازت نہیں دیں گے" اس واقعے کی روشنی میں عورتوں کے مسجد میں نماز کے لیے آنے پر پابندی کی وضاحت فرمائیں۔

(۵) عیدین اور جمعہ کی نمازیں جو کہ جماعت کے بغیر ادا نہیں ہوتیں، کیا خواتین کو ان سے مستثنیٰ رکھنے کا کوئی حکم قرآن و حدیث میں کہیں موجود ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر وضاحت فرمائیں کہ وہ مسجد میں آ کر جماعت میں شریک ہوئے بغیر یہ نمازیں کس طرح ادا کرسکتی ہیں؟ اگر پردہ اور الگ صفوں کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان نمازوں کو ادا کرنے سے محروم رہتی ہیں تو کیا اس کا گناہ مردوں کے سر نہیں ہے، جو ان نمازوں کے لیے خواتین کے مسجد میں آنے کا معقول انتظام کرنے کے بجائے ان کا مسجد میں آنا ہی ممنوع قرار دیتے ہیں؟

جواب:

آپ نے سوالات جس ترتیب سے کیے ہیں اس ترتیب سے جواب دینے کی جگہ اصل مسئلہ کی تھوڑی سی وضاحت کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہ بحث میڈیا میں اس طرح جاری ہے جیسے علماء اسلام آج ایک نئی صورت حال سے دوچار ہیں۔ بعض علماء نے حالات کے دباؤ کے تحت عورتوں کو ان کا وہ حق دیا ہے جو انھیں حاصل نہیں تھا اور بعض اس کی مخالفت کر

رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ اس سلسلے کی ہدایات صحیح احادیث میں موجود ہیں اور فقہاء کرام نے اس پر تفصیل سے غور کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا استأذنت امراة احدكم الى المسجد فلا يمنعها[۱] — جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو وہ اسے منع نہ کرے۔

احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں خواتین مسجد جایا کرتی تھیں۔ دوسری طرف احادیث ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کا مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں نماز پڑھنا بہتر اور افضل ہے۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ ہی کی حدیث ہے:

لاَ تمنعوا نساء كم المساجد و بيوتهن خير لهن[۲] — اپنی عورتوں کو مساجد میں جانے سے منع مت کرو، لیکن ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔

روایات میں یہاں تک آتا ہے کہ عورت کے لیے بہتر اور افضل ہے کہ وہ اپنے گھر میں بھی کسی کوٹھری میں نماز ادا کرے۔[۳]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورتوں کے مسجد جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس پر آپ نے لکھا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ اس کے بالمقابل صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے صاحب زادے کی اس بات پر سخت ناراض ہوئے تھے کہ وہ عورتوں کے مسجد آنے پر پابندی لگانا چاہتے تھے۔ یہاں آپ سے ایک چوک ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا ہے وہ حضرت عمرؓ کا نہیں، بلکہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ

۱۔ بخاری، كتاب النكاح، باب استئذان المرأة زوجها في الخروج الى المسجد.
مسلم كتاب الصلوٰة، باب خروج النساء الى المساجد الخ

۲۔ ابوداؤد، كتاب الصلوة، باب ماجاء في خروج النساء الى المسجد

۳۔ ابوداؤد، كتاب الصلوة، باب التشديد في ذالك

نے جب یہ حدیث سنائی کہ عورتوں کا مسجد میں حصہ ہے، اس سے انھیں منع نہ کرو تو ان کے صاحب زادے بلالؓ نے کہا:

"خدا کی قسم ہم تو ضرور منع کریں گے۔" اس پر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ خفا ہو گئے کہ میں تمھیں رسولِ خداؐ کا ارشاد سنا رہا ہوں اور تم اس کے مقابلے میں اپنی بات پر اصرار کر رہے ہو۔[1]

در حقیقت حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو اپنے صاحب زادے کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ ورنہ وہ بھی جانتے تھے کہ عورت کو مسجد جانے کی اجازت دینے یا نہ دینے کا آدمی کو حق حاصل ہے۔

فقہاء کرام نے حالات اور زمانے کے بگاڑ کی وجہ سے عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خواتین پانچوں وقت مردوں کے ساتھ مسجد آنے جانے لگیں تو موجودہ بگڑے ہوئے حالات میں بہت سے ناپسندیدہ واقعات پیش آسکتے ہیں۔ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر عورت سن رسیدہ ہو، بن سنور کے نہ نکلے اور ایسے اوقات نہ ہوں جب کہ مفسد اور بد اخلاق لوگ گھومتے پھرتے ہیں تو وہ مسجد جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے اس کا فیصلہ حالات ہی کے پیش نظر کیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی جگہ عورتیں مسجد بالعموم جاتی ہوں اور وہاں اخلاقی خرابیوں کا اندیشہ بھی نہ ہو تو میری رائے یہ ہے کہ اس کی گنجائش ہونی چاہیے۔

رسولِ اکرم ﷺ کے دور میں نماز جمعہ کے لیے عورتیں مسجد جایا کرتی تھیں۔ عیدین میں بھی ان کی شرکت کا ثبوت موجود ہے۔ بلکہ اس کی ترغیب دی گئی ہے، اس لیے جہاں کسی خطرہ کا اندیشہ نہ ہو عورتیں ان نمازوں میں شریک ہوسکتی ہیں۔ آج بھی

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح مسلم میں ہے۔ کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یترتب علیه فتنة و انها لا تخرج مطیبة

بعض مقامات پر اس کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دینی مصالح کا تقاضا ہو جیسے مسجد میں وعظ ونصیحت کی مجلس ہو رہی ہو اور ان کے لیے الگ نظم ہو، تو اس میں ان کی شرکت ہوسکتی ہے۔ آخر میں یہ گزارش ہے کہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا عورت کے لیے نہ فرض اور واجب ہے اور نہ اس کا استحباب ہی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے ایک مسئلہ پر زور دینا، فقہی اختلافات کو ابھارنا اور اس کے لیے تحریک چلانا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ دین وملت کی کوئی مفید خدمت نہیں ہے۔

اسلامی ریاست میں عورت کی قیادت

سوال:

ایک محترمہ اپنے مکتوب میں لکھتی ہیں:

میں عورت کی سربراہی کی حمایت (Favour) نہیں کرتی، اس لیے کہ شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے وہ امامت و قیادت کے فرائض ادا نہیں کرسکتی۔ جسمانی طور پر (Physically) بھی یہ اس کے لیے نہیں ہے۔

حدیث اور قرآن سے یہ واضح ہے کہ عورت کی سربراہی ناپسندیدہ ہے، مگر کیا اسے ہر حالت میں حرام یا ناجائز کے دائرہ(Category) میں رکھنا درست ہوگا؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ ناگزیر حالات (Emergency condition) میں عورت کی سربراہی گوارا کی جاسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کے حالات میں عورت کو سربراہ بنانا جائز ہے یا حرام اور ناجائز؟ اگر جائز ہے تو Emergency حالات کون سے ہوں گے اور کون ان کا تعین کرے گا؟

آپ نے اپنی کتاب 'عورت اسلامی معاشرہ میں' لکھا ہے کہ اس معاملہ میں اجماع ہے۔ گزارش یہ ہے کہ اس اجماع کی تفصیلات (Details) بتائیں تاکہ امت کے سامنے صحیح پوزیشن آسکے۔

جواب:

عورت ریاست کی سربراہ ہوسکتی ہے یا نہیں اس پر ادھر جو بحثیں ہوئی ہیں ان میں سے بعض میری نظر سے بھی گزری ہیں، لیکن میری رائے یہی ہے کہ اسلام نے اس منصب کے لیے جو شرائط رکھی ہیں، وہ اس میں نہیں پائی جاتیں اور جن حدود کا اسے پابند بنایا ہے ان کی پابند رہ کر اس کا حق ادا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ حدیث اور قرآن کی رو سے عورت کی سربراہی ''ناپسندیدہ'' ہے۔ میرے نزدیک ناپسندیدہ نہیں، ناجائز ہے۔ آپ کے خط کی تفصیلات بتاتی ہیں کہ اس سے آپ کو بھی اتفاق ہے۔

رسول خدا ﷺ کے علم میں جب یہ بات آئی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو تختِ سلطنت پر بٹھایا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ''[1] (وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے عورت کو اپنا سربراہ بنایا) اس تنبیہ سے امت کے علماء وفقہاء نے یہی سمجھا ہے کہ عورت کو اس منصب پر فائز کرنا ناجائز اور تباہی کو دعوت دینے کے ہم معنی ہے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اس ارشاد کا تعلق خاص اہل فارس سے اور اسی دور سے ہے۔ یہ کوئی ابدی حکم نہیں ہے۔ حالاں کہ آپ نے ایک عام قانون بیان فرمایا ہے۔ اس میں اس بات کا نہ تو کوئی اشارہ پایا جاتا ہے اور نہ کسی نے آج تک یہ سمجھا ہے کہ یہ وقتی اور عارضی بات ہے، بلکہ اسے ایک ابدی حکم ہی کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی لیے کسی بھی دور میں عورت کا کسی اسلامی ریاست کا سربراہ ہونا جائز نہیں ہے۔

اضطراری حالات فرد کو بھی لاحق ہوسکتے ہیں اور کسی گروہ کو بھی ان سے سابقہ پیش آسکتا ہے۔ جہاں تک فرد کے اضطرار کا تعلق ہے، قرآن مجید نے اس صورت میں بعض احکام میں رخصت عطا کی ہے۔ مثال کے طور پر آدمی کو حلال اور طیب چیزیں

---

[1] بخاری، کتاب المغازی و رواہ الترمذی والنسائی و احمد

کھانے کا حکم ہے، لیکن اس کی جان پر بن آئے اور کوئی حلال چیز دست یاب نہ ہوتو حرام اور ناجائز چیز استعمال کر کے بھی وہ اپنی جان بچا سکتا ہے، بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک اس صورت میں اس کا جان بچانا ضروری ہے ورنہ وہ گنہ گار ہوگا۔ انھوں نے فرد کے اضطراری حالات اور ان کے احکام پر تو تفصیل سے بحث کی ہے، البتہ اس طرح کی تفصیلات ہمیں جماعت کے اضطرار کے مسئلہ میں نہیں ملتیں۔ لیکن بعض اشارات سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر شریعت کا حکم ہے کہ مسلمانوں کا امام متقی اور خدا ترس ہو، لیکن مجبوری میں اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے فاسق و فاجر کی قیادت بھی برداشت کی جاتی ہے۔ یہ ایک مجبوری ہے اس سے عام قانون بدل نہیں سکتا۔

ٹھیک اسی طرح عورت کی سربراہی کو اسی وقت گوارا کیا جاسکتا ہے جب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو اور ملک وملت کو اس کی مخالفت سے کسی سنگین خطرہ کا اندیشہ ہو۔ اس کا فیصلہ کرنا ہر ملک کا اپنا کام ہے۔

اگر کسی اسلامی ملک میں عورت اقتدار میں آجائے تو پرامن طریقے سے اسے بدلنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ البتہ اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا صحیح نہ ہوگا، جس سے فتنہ وفساد پھوٹ پڑے اور ریاست کو نقصان پہنچے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مسئلہ میں اجماع کی تفصیلات بتائی جائیں، تو عرض ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں علامہ سعد الدین تفتازانی، علامہ ابن عابدین اور قاضی شوکانی وغیرہ کے حوالوں سے لکھا ہے کہ عورت کی امارت جائز نہیں ہے۔ یہ بھی صراحت کی ہے کہ بقول امام ابن حزم اس پر اجماع ہے۔ ایک اور مضمون میں شاہ عبد الحق محدث دہلوی، حضرت شاہ ولی اللہ، ابن عربی مالکی اور ابن قدامہ حنبلی کے حوالے فراہم کیے ہیں۔[۱] ان علماء کا مختلف مکاتبِ فقہ سے تعلق ہے۔ اس کے بعد مزید تصریحات کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی معتبر رائے موجود نہیں ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو ماہ نامہ زندگی نو، اپریل ۱۹۸۹ء

نکاح میں ولی کی شرط اور اس کا اختیار

سوال:

نکاح کے لیے ولی کی شرط اور اس کے اختیار سے متعلق بعض سوالات پیش خدمت ہیں۔ ان کا جواب مطلوب ہے۔

۱- کیا مسلمان عورت جو عاقلہ اور بالغہ ہے اس کا ولی کسی ایسے شخص سے اس کا نکاح کرسکتا ہے جسے وہ ناپسند کرتی ہے۔ کیا اس طرح کی لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف نکاح پر مجبور کرنے کا ولی کو اختیار حاصل ہے؟

۲- کیا کسی مسلمان عورت کے لیے جو بالغہ عاقلہ ہے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے نکاح کرلے، چاہے ولی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ باپ یا ولی کی مرضی کے خلاف جو نکاح ہو اس کا کیا حکم ہے؟

۳- کیا کسی نابالغہ کے باپ یا ولی کو اس کا حق حاصل ہے کہ بلوغ سے پہلے ہی اس کا نکاح کردے؟ اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا بلوغ کے بعد اس نکاح کو باقی رکھنا لڑکی کے لیے ضروری ہے؟

۴- ولی کی قانونی حیثیت کیا ہے؟

یہ ایک اہم معاشرتی مسئلہ ہے، اس میں شریعت کا نقطۂ نظر وضاحت سے آنا چاہیے۔

جواب:

ذیل میں آپ کے سوالات کے سلسلے میں شریعت کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی

کوشش کی جا رہی ہے۔

۱- بخاری، مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاَ تنكح الأيّم حتى تستأمر ولاَ تنكح البكر حتى تستأذن قالوا يا رسول الله كيف اذنها قال ان تسكت.[1]

'ایّم' (بیوہ یا مطلقہ) کا نکاح اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ اس سے مشورہ نہ کرلیا جائے اور دوشیزہ کا نکاح اس وقت ہوگا جب کہ اس سے اجازت حاصل کرلی جائے۔ دریافت کیا گیا کہ دوشیزہ اجازت کیسے دے گی؟ فرمایا کہ وہ سکوت اختیار کرے (تو یہ اس کی جانب سے اجازت ہے)۔

حدیث میں 'ایّم' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو، چاہے وہ باکرہ ہو یا غیر باکرہ۔ یہ اس مرد کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کے بیوی نہ ہو۔[2] یہاں یہ غیر باکرہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ ایک اور حدیث میں اس کی جگہ لفظ 'ثیّب' آیا ہے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نقل فرماتے ہیں۔

الثيب احق بنفسها من وليها والبكر تستأمر و اذنها سكوتها[3]

'ثیب' اپنے نفس (نکاح) کے معاملہ میں اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے اور باکرہ کی رائے لی جائے گی اور اس کی خامشی اس کی اجازت ہوگی۔

ان احادیث میں ایّم اور ثیّب کے الفاظ غیر باکرہ کے لیے آئے ہیں اور 'بکر' کے معنی دوشیزہ اور باکرہ کے ہیں۔ ان احادیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ 'ثیّب' یا

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب لا ینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الا برضاها۔ مسلم، کتاب النکاح، باب استیذان الثیب فی النکاح بالنطق والبکر بالسکوت

[2] علامہ مجد الدین فیروز آبادی کہتے ہیں: الایم۔ من لا زوج لها بکرا کان او ثیبا و من لا امرأة له۔ القاموس المحیط مادہ 'ایم'

[3] مسلم، کتاب النکاح، باب استیذان الثیب فی النکاح بالنطق والبکر بالسکوت

غیر باکرہ کو اپنے نکاح کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق اس کے ولی سے زیادہ ہے۔ اس کا نکاح اسی وقت اس کا ولی کرسکتا ہے جب کہ اس کی رضامندی حاصل ہو۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ 'ثیّب' یا غیر باکرہ کا نکاح اس کی مرضی سے ہوگا۔ ولی اسے مجبور نہیں کرسکتا۔ لیکن باکرہ اور دوشیزہ کے متعلق امام شافعی اور امام احمدؒ وغیرہ کی رائے ہے کہ اس سے اجازت حاصل کرنا پسندیدہ تو ہے لیکن اولیاء میں باپ اور دادا کو ان کی شفقت و محبت اور تعلقِ خاطر کی وجہ سے یہ حق حاصل ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر بھی اس کا نکاح کردیں۔

اس معاملے میں امام ابوحنیفہؒ، امام اوزاعی اور بعض دوسرے اصحاب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بالغہ کا نکاح، چاہے وہ ثیّب ہو یا باکرہ اس کی مرضی ہی سے ہوگا ثیّب کی طرح باکرہ کو، جو بالغہ ہے، مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ہدایہ میں ہے:

ولا یجوز للولی اجبار البکر البالغة علی النکاح [۱]	ولی کے لیے جائز نہیں ہے کہ دوشیزہ کو جو کہ بالغہ ہے نکاح پر مجبور کرے۔

اوپر جو احادیث گزر چکی ہیں ان کی اور بعض دوسری ہم معنی احادیث کی بنا پر فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جو عورت 'ثیب' ہے اس کا نکاح اس کا ولی اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ وہ صاف الفاظ میں اپنی آمادگی کا اظہار کرے۔ علامہ نوویؒ کہتے ہیں:

و اما الثیب فلا بد فیها من النطق بلا خلاف سواء کان الولی ابا او غیره [۲]	جہاں تک 'ثیب' کا تعلق ہے اس کا اپنی زبان سے اپنی آمادگی کا ظاہر کرنا ضروری ہے (اس کا سکوت کافی نہیں ہے) ولی چاہے باپ ہو یا کوئی دوسرا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

باکرہ شرم وحجاب کی وجہ سے صراحت کے ساتھ اپنی مرضی کا اظہار نہیں کرسکتی،

---

۱ ہدایہ مع فتح القدیر: ۳/۲۵۱

۲ نووی، شرح مسلم، ج۵، جزء۹، ص ۱۷۵

اس لیے حدیث میں کہا گیا ہے کہ 'فان سکتت فقد رضیت'، یعنی اگر وہ سکوت اختیار کرلے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ راضی ہے۔ سکوت کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ یہ بات صاف معلوم ہونی چاہیے کہ سکوت رضا مندی کی دلیل ہے۔ لیکن جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے قرائن سے اس کا پتہ چل جاتا ہے کہ سکوت میں آمادگی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر وہ مسکرا دے یا کوئی ہدیہ قبول کرلے تو سمجھا جائے گا کہ اسے اتفاق ہے، لیکن اگر دریافت کرنے پر رونے لگے یا چہرہ سے ناگواری کا اظہار ہو رہا ہو تو اسے عدم اتفاق خیال کیا جائے گا۔ بہرحال اس کے اندر آمادگی نہ پائی جائے یا وہ انکار کردے تو فقہ حنفی کی رو سے اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

الیتیمة تستأمر فی نفسها فان صمتت فهو اذنها و ان ابت فلا جواز علیها[1]

یتیم لڑکی (جو بالغ ہوچکی ہے) اس کی ذات کے معاملے میں (یعنی نکاح کے معاملے میں) رائے لی جائے گی۔ اگر وہ خاموش ہوجائے تو یہ اس کی اجازت ہوگی۔ اگر انکار کردے تو اس پر کسی کو کوئی اختیار نہ ہوگا۔

یہاں 'یتیمة' سے مراد وہ لڑکی ہے جو یتیم تھی اور اب بالغہ ہے۔ اس لیے کہ نابالغہ کے احکام دوسرے ہیں۔ اس سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

اجازت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جس شخص سے نکاح کا ارادہ ہو، اس کی دینی، اخلاقی، سماجی اور معاشی حیثیت کے بارے میں ٹھیک معلومات اسے فراہم کی جائیں۔ تاکہ وہ اطمینان سے فیصلہ کرسکے۔

ہمارے معاشرہ میں شادی کے معاملہ میں عورت کی رائے عموماً اور خاص طور پر دوشیزہ کی رائے شامل نہیں ہوتی۔ اولیاء اپنی پسند سے اس کا عقد کردیتے ہیں۔ یہ ایک

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب الولی فی النکاح و استیذان المرأۃ بحوالہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی

[2] ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح: ۲۹۸/۶

غلط طریقہ ہے۔ احادیث سے اس کا غلط ہونا ثابت ہے۔ اسلام نے عورت کو جب حقِ نکاح دیا ہے تو اسے اس حق سے محروم کرنا صریح زیادتی ہے۔

۲- اب دوسرے سوال کو لیجیے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَا نکاح الّا بولی[۱] نکاح ولی ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔

اس حدیث سے امام شافعی اور امام احمد نے یہ استدلال کیا ہے کہ ولی کے بغیر عورت کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ پست طبقے کی کوئی عورت تو اپنا نکاح خود کرسکتی ہے یا اپنے نکاح کے لیے کسی کو وکیل بنا سکتی ہے، لیکن شریف عورت کے لیے ولی کا ہونا ضروری ہے۔ احناف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو عورت عاقلہ بالغہ ہے وہ براہِ راست اپنا نکاح کرسکتی ہے اور دوسری عورت کا نکاح کرا بھی سکتی ہے۔ اس لیے کہ بلوغ کے بعد حقِ ولایت ختم ہو جاتا ہے۔[۲]

احناف کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب ایک بالغہ اپنی آزاد مرضی سے خرید و فروخت، صدقہ و خیرات، ہبہ اور وصیت جیسے مالی تصرفات کرسکتی ہے تو یہ فیصلہ بھی کرسکتی ہے کہ کس شخص سے نکاح ہو، مہر کی مقدار کیا ہو، نان نفقہ کی نوعیت کیا ہو؟ اس میں بہ ظاہر کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔

فقہ حنفی میں اس سلسلہ میں ایک اصول یہ بیان ہوا ہے کہ جو شخص اپنے مال میں تصرف کرسکتا ہے وہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی فیصلہ کا حق رکھتا ہے۔[۳]

شریعت نے عورت کو جو آزادی دی ہے یہی رائے اس سے ہم آہنگ نظر آتی

---

[۱] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب الولی فی النکاح و استیذان المرأۃ۔ بحوالہ احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ اور دارمی۔

[۲] ولا تجبر البالغۃ البکر علی النکاح لانقطاع الولایۃ بالبلوغ۔ رد المحتار علی الدر المختار: ۴/۱۵۹

[۳] درمختار میں ہے۔ والاصل ان کل من تصرف فی مالہ تصرف فی نفسہ ومالا فلا۔ الدرالمختار مع رد المحتار: ۴/۱۵۵۔

ہے۔ 'لاَ نکاح الاّ بولی' کا مطلب ان کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ نکاح کے لیے ولی کا ہونا شرطِ لازم ہے اور اس کے بغیر نکاح نہیں ہوگا۔ درحقیقت اس میں ایک پسندیدہ طریقہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ولی کے ذریعے نکاح ہو۔ یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ عورت خود سے نکاح کرلے۔ لیکن اس سے بالغہ کے حق نکاح کی تردید نہیں ہوتی۔ ولی کے بغیر بھی نکاح ہوجائے گا۔ اس سے دونوں طرح کی احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

۳- نابالغہ کے نکاح کا ثبوت قرآن و حدیث سے ملتا ہے۔ قرآن مجید میں مطلقہ کے لیے عدت تین حیض بیان ہوئی ہے (البقرۃ: ۲۲۷) ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ جن عورتوں کی ماہ واری بند ہوچکی ہے یا جن کی ماہ واری شروع ہی نہیں ہوئی ہے ان کی عدت تین ماہ ہے (الطلاق: ۴)۔

حیض یا ماہ واری بلوغ کی دلیل ہے۔ آیت سے معلوم ہوا کہ بلوغ سے پہلے لڑکی کا نکاح ہوسکتا ہے ورنہ اس کی طلاق اور عدت کے بیان کی ضرورت نہ تھی۔

کتبِ حدیث میں صحیح ترین روایت موجود ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح ان کی کم سنی ہی میں رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی اور نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی عمل میں آئی۔[1]

اس حدیث کے بارے میں علامہ ابن ہمامؒ کہتے ہیں (نص قریب من المتواتر)[2] یعنی یہ حدیث حد تواتر کے قریب پہنچ چکی ہے۔

اس بات پر علماء کا ہمیشہ سے اتفاق رہا ہے کہ لڑکے یا لڑکی کے بلوغ سے پہلے ان کا باپ (ولی) مصلحت کا تقاضا ہو تو دونوں میں سے کسی کو بھی نکاح پر مجبور کرسکتا ہے۔ صرف ابن شبرمہ، ابوبکر الاصم اور عثمان بتیؒ سے اس سلسلے میں اختلاف منقول ہے۔ ان کے نزدک نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح جائز نہیں ہے۔[3]

---

[1] بخاری مناقب الانصار۔ باب تزویج النبی عائشۃ۔ مسلم کتاب النکاح، باب تزویج الاب البکر الصغیرۃ [2] فتح القدیر: ۳/۲۶۵

[3] ابن رشد، بدایۃ المجتھد: ۴/۲۱۰ ابن شبرمہ اور ان کے ہم خیال لوگوں کے دلائل کے لیے ملاحظہ ہو رد المحتار پر محقق کا حاشیہ ۴/۱۷۰

نابالغہ کے نکاح کا حق ولی کو اس لیے دیا گیا ہے کہ بعض اوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ ولی اسے ضروری خیال کرتا ہے۔ جیسے بہت ہی موزوں رشتے کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ ولی کی شدید علالت یا معاشی مجبوری بھی اس کا سبب بن سکتی ہے۔ لڑکی سے ولی کے تعلق، محبت اخلاص اور جذبۂ خیر خواہی سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ جو قدم اٹھائے گا لڑکی کے حق میں مفید ہوگا۔

امام مالک کہتے ہیں کہ لڑکی کے اولیاء میں یہ حق صرف باپ کو حاصل ہے کہ نابالغ لڑکی کا نکاح کردے۔

امام شافعیؒ نے باپ ہی کے حکم میں دادا کو بھی رکھا ہے۔ ان کے نزدیک اولیاء میں باپ اور دادا کے علاوہ کسی دوسرے کو نابالغ لڑکے کے نکاح کا حق حاصل نہیں ہے، اس کے ساتھ شوافع نے یہ بھی کہا ہے کہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ باپ دادا بھی اسی وقت اس کی شادی کریں جب کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائے اور اس سے اجازت لے لی جائے تاکہ یہ نہ ہو کہ ناگواری کے ساتھ اسے اس رشتہ کو برداشت کرنا پڑے۔[1]

امام مالک، امام شافعی اور بعض دوسرے فقہا کے نزدیک بلوغ کے بعد اس نکاح کو ختم کرنے کا لڑکی کو حق حاصل نہ ہوگا۔ اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ نابالغ لڑکی اور لڑکے کا نکاح باپ دادا کردے تو بلوغ کے بعد انھیں اختیار نہ ہوگا، اس لیے کہ ان کی سوجھ بوجھ شفقت و محبت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بلوغ کے بعد ان کی اجازت سے وہ ان کا عقد کریں، البتہ ان کے علاوہ عصبات میں سے کوئی دوسرا شخص جو ان کا ولی ہے ان کا نکاح کردے تو بلوغ کے بعد انھیں منظور کرنے یا نہ کرنے کا اختیار باقی رہے گا۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر لڑکی کی عمر بلوغ سے پہلے اتنی ہو چکی ہے کہ وہ معاملات کو سمجھتی ہے اور حالات سے باخبر ہے، اس کے بعد وہ اپنی منظوری دیتی ہے تو

---

[1] نووی شرح مسلم، ج ۵، ص ۱۶۷

اسے خیار بلوغ نہ حاصل ہوگا ورنہ حاصل رہے گا۔ موجودہ حالات میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ کے نکاح کا حق صرف باپ دادا تک محدود ہو جیسا کہ امام شافعیؒ کی رائے ہے، اور امام مالک بھی باپ کی حد تک اتفاق کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 'ولی' کا لفظ عام ہے، اس لیے ہر ولی کو یہ حق حاصل رہے گا اگر اس کے اقدام سے لڑکے یا لڑکی کو نقصان پہنچ رہا ہو تو قاضی اس نکاح کو ختم کردے گا۔ یہ بات اصولی طور پر تو صحیح ہے لیکن یہ ایک طویل اور پیچیدہ عمل ہے۔ بلوغ کے بعد لڑکے یا لڑکی کے لیے یہ ثابت کرنا آسان نہیں ہے کہ ولی نے جو اقدام کیا ہے وہ غلط ہے۔ اب اسے وہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔

۴- سماج میں جو لوگ بے شادی شدہ ہیں، قرآن و حدیث میں ان کے اولیاء کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان کا نکاح کردیں اور جو خواتین نکاح کرنا چاہیں انھیں اس سے باز نہ رکھیں۔ اس سے ولی کی ذمے داری اور اختیار ثابت ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ نکاح کے معاملہ میں عورت بااختیار ہے اور اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے۔ اس وجہ سے علماء و فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے اور بعض اوقات ایک ہی آیت یا حدیث سے دونوں طرح کے استدلال کیے گئے ہیں۔ علامہ ابن رشد جانبین کے دلائل پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان سے کوئی ایک پہلو قطعی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔[1]

گزشتہ صفحات میں اس موضوع سے متعلق بعض احادیث اور ان سے فقہاء کے استدلالات کا ذکر آچکا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک صحتِ نکاح کے لیے ولی کا ہونا شرط ہے۔ اس کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔ البتہ ثیب یا غیر باکرہ کو ولی مجبور نہیں کرسکتا۔ اس کی رضامندی ہی سے اس کا نکاح ہوسکتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک 'ثیّب' وہ ہے جس کی بکارت زائل ہوگئی ہو، چاہے یہ نکاح صحیح سے ہو یا نکاحِ فاسد سے، شبہ کی بنیاد پر اس کے ساتھ ہم بستری ہوگئی ہو یا اس کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا گیا ہو

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن رشد' بدایۃ المجتہد: ۴ / ۲۱۴-۲۲۳

بلکہ کسی بھی طبعی یا غیر طبعی طریقہ سے، جیسے اچھل کود، غیر فطری عمل یا عمر کی زیادتی کی وجہ سے اس کی بکارت ختم ہوجائے تو وہ 'ثیب' ہے۔ امام نووی نے اسے شوافع کا صحیح ترین قول قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات کچھ باوزن نہیں معلوم ہوتی کہ جس عورت کا جائز، ناجائز، فطری، غیر فطری کسی بھی طریقے سے پردۂ بکارت چاک ہوجائے اسے 'ثیّب' قرار دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اس کی شرم و حیا باکرہ کی طرح نہیں رہی اور وہ صاف الفاظ میں نکاح کی منظوری دے گی۔

امام نووی کہتے ہیں: حدیث میں 'الایم احق بنفسها من ولیها' کے الفاظ آئے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ثیب' کے نکاح میں ولی کو بھی بہرحال اختیار حاصل ہے۔ البتہ اسے اپنے بارے میں فیصلہ کا حق ولی سے زیادہ ہے۔ اس وجہ سے اگر ولی ثیّب کا نکاح اس کے کفو میں کرنا چاہے اور وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوتو اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ کسی ایسے شخص سے جو اس کا کفو ہے نکاح کرنا چاہے اور ولی تیار نہ ہوتو اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ مخالفت نہ کرے اس کے باوجود اگر وہ اصرار کرے تو ولی کی جگہ قاضی نکاح کردے گا۔[1]

جہاں تک باکرہ کا تعلق ہے ولی اس کی مرضی جاننے کی کوشش کرے گا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا وہ اس کا پابند نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں فقہ شافعی میں بکارت کو جس طرح بنیاد بنایا گیا ہے اس سے فقہ حنفی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے اگر کسی عورت کا پردۂ بکارت اچھل کود یا حیض کا خون کثرت سے جاری ہونے یا چوٹ لگنے یا عرصہ تک شادی نہ ہونے کی وجہ سے چاک ہوجائے یا نکاح کے بعد خلوت اور ہم بستری سے پہلے ہی علیٰحدگی عمل میں آجائے یا اس سے اتفاق سے زنا کا ارتکاب ہوجائے تو وہ باکرہ ہی کے حکم میں ہے۔ ہاں اگر وہ زانیہ کی حیثیت سے مشہور ہو اور اس پر حد نافذ ہوئی ہو یا نکاح فاسد یا شبہ کی

---

[1] نووی۔ شرح مسلم، ج۵، جزء۹، ص ۱۷۴، ۱۷۵

بنا پر اس کے ساتھ ہم بستری ہوئی ہو تو وہ 'ثیب' قرار پائے گی۔[۱]

یہ ایک معقول نقطۂ نظر ہے۔ احناف کے نزدیک عورت کو اپنے نکاح کا اختیار بکارت کی بنیاد پر نہیں بلکہ بلوغ کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے جو عورت بالغہ ہے، چاہے وہ باکرہ ہو یا غیر باکرہ اپنی مرضی سے نکاح کرسکتی ہے۔ ولی کے ذریعے نکاح کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

'لا نکاح الا بولی' (نکاح ولی ہی کے ذریعے ہوگا) کے متعلق فقہ حنفی میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حدیث ان روایات کے مقابلے میں کم زور ہے جن سے عورت کا حقِ نکاح ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نکاح کے لیے ولی کا ہونا شرطِ لازم ہے اور اس کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔ اس میں کوئی قانون نہیں بیان ہوا ہے بلکہ ایک پسندیدہ عمل کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ بات ناپسندیدہ ہے بلکہ بے حیائی کی خیال کی جاتی ہے کہ عورت خود سے نکاح کرلے۔ اس سے بالغہ کے حق نکاح کی تردید نہیں ہوتی۔

اس حدیث کو ایک اصول و قانون کے طور پر تسلیم کرلیا جائے تو بھی دوسری احادیث کی روشنی میں اس کا تعلق نابالغ یا نابالغہ سے ہوگا، جس میں ولی کو اختیار حاصل ہے۔ ولی کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

فقہاء احناف اور بعض دوسرے فقہاء کے ہاں بالغہ اگر غیر کفو میں نکاح کرلے تو ولی کو اعتراض کا حق ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق عورت ہی سے نہیں اس کے خاندان سے بھی ہے۔ ہاں، اگر ولی کو اعتراض نہ ہو تو نکاح صحیح ہوگا۔ اگر اعتراض ہو تو نکاح صحیح نہ ہوگا اور قاضی اسے فسخ کرا دے گا۔ ولی کو اعتراض کا حق اسی وقت تک حاصل رہے گا جب تک کہ عورت بچہ کو جنم نہ دے یا واضح طور پر حمل نہ قرار پائے۔ اس کے بعد یہ حق باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ اس میں بچہ کا مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔[۲]

---

[۱] ردالمحتار مع درالمختار: ۴/۱۶۶، ۱۶۷

[۲] اس سلسلے کی اور بھی تفصیلات کتب فقہ میں بیان ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہو ہدایہ مع فتح القدیر: ۳/۲۴۸، ۲۴۹۔ نیز ردالمحتار مع درالمختار: ۴/۱۵۶، ۱۵۷

ولی کے ذریعہ نکاح

سوال:

مجھ سے ایک صاحب نے کچھ سوالات کیے۔ چوں کہ یہ سوالات نئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ کسی عالم دین سے ان کا جواب معلوم کر کے بتا سکوں گا۔ ان سوالات کے لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

۱- سوال کنندہ کی والدہ اور لڑکا امریکہ میں تقریباً دو سال سے نو آباد کی حیثیت سے سکون پذیر ہیں۔

۲- سوال کنندہ کی والدہ یہاں ہندستان آ کر اپنے بھائی کی لڑکی سے اپنے لڑکے کے لیے منگنی کر کے واپس امریکہ چلی گئیں۔

۳- اس وقت لڑکا امریکہ میں ہے۔ لڑکے کے نکاح کے لیے لڑکا اور والدہ دوبارہ ہندستان آ کر نکاح کر کے بہو کو امریکہ لے جانا چاہتے ہیں، اس لیے کہ بہو کو امریکہ لے جا کر (Sponsor) اسپانسر یعنی کفیل کرانے کے لیے کم از کم ایک سال کی مدت تو ضرور ہوگی بلکہ کچھ زیادہ بھی۔ جب ہی اس کو ویزا (Visa) ان کو جانے کے لیے ملے گا۔ یعنی شادی کے بعد دولھا امریکہ جا کر اپنی دلھن کو اسپانسر کرنے پر ویزا مل سکتا ہے جو کافی مدت کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

اس مدت کو مختصر کرنے کے لیے اگر نوشہ امریکہ میں رہتے ہوئے ٹیلی فون پر نکاح کر کے نکاح نامہ حاصل کرلے تو اس کی بنیاد پر دلھن کو امریکہ جانے کے بعد ازسرِنو شریعت کے مطابق دوبارہ نکاح کروانے کے لیے وہ تیار ہے۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ اس طرح سے فون پر کیا ہوا نکاح جائز ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اس طرح کے نکاح کی وساطت سے امریکہ جا کر پھر شریعت کے مطابق دوبارہ نکاح کروا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب:

آپ کے سوال کا آسان حل یہ ہے کہ لڑکی کا ولی اس کی مرضی معلوم کرنے کے بعد لڑکے کو ایک خط کے ذریعے یہ اطلاع بھیج دے کہ میں نے اپنی لڑکی کا نکاح اتنے مہر کے ساتھ تم سے کردیا ہے۔ اس خط کو لڑکا کچھ لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنائے اور کہے کہ میں نے اس لڑکی کو اپنے نکاح میں مہر مذکور کے ساتھ لے لیا ہے تو نکاح ہوجائے گا۔ کچھ لوگوں کے سامنے سنانا اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ نکاح کے گواہ ہوں۔ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو بھی کافی ہے۔ اس کے بعد وہ قانونی کارروائی ہوسکتی ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ و اللہ اعلم

کفاءت کا مسئلہ

سوال:

شادی بیاہ کے معاملے میں کفو کا مسئلہ ہمیشہ رہا ہے۔ شاید ہمارے فقہاء کے یہاں اس پر بڑا زور ہے۔ اب اس پر یہ بحث شروع ہوگئی ہے کہ اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے یا نہیں۔ براہِ کرم واضح فرمائیں کہ فقہاء کا نقطۂ نظر فی الواقع کیا ہے؟ اس مسئلہ میں ہم آپ کی رائے بھی جاننا چاہتے ہیں۔

جواب:

کفاءت کے مسئلہ میں بہت اختصار کے ساتھ ذیل میں گفتگو کی کوشش کی جائے گی۔

کفاءت کا سوال عورت کے سلسلے میں پیدا ہوتا ہے مرد کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ اپنے سے کم تر حیثیت کی عورت سے نکاح کرسکتا ہے البتہ زیادہ تر فقہاء کرام کے نزدیک عورت کا نکاح اس کی حیثیت یا اس سے برتر حیثیت کے مرد سے ہونا چاہیے ورنہ وہ اسے اپنی ذلت محسوس کرے گی اور ازدواجی تعلقات پر اس کا خراب اثر پڑے گا۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کفاءت کا اعتبار پانچ چیزوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں: نسب، آزادی، دین داری، مال اور صنعت وحرفت۔

نسب کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ قریش اور غیر قریش، عرب وعجم، ایک دوسرے کے برابر نہیں ہیں۔ اس لیے ایک قریشی عورت کا کفو غیر قریشی مرد نہیں ہے۔ اسی طرح جو عورت عرب سے تعلق رکھتی ہے، عجم کا رہنے والا اس کا کفو نہیں ہے۔

ایک تقسیم قدیم الاسلام اور جدید الاسلام کی بھی کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے نو مسلم کو خاندانی مسلمان کے مساوی نہیں قرار دیا گیا ہے۔

جہاں تک آزادی اور غلامی کا سوال ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی باندی آزاد ہو جائے اور اس کا شوہر غلام ہو تو اسے حقِ خیار حاصل ہوگا، وہ چاہے تو غلام شوہر سے اس کا نکاح فسخ ہو جائے گا۔[۱]

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو غلام ہے وہ آزاد عورت کا کفو نہیں ہے۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ جو شخص خاندانی طور پر آزاد چلا آرہا ہے اس کا کفو وہ شخص نہیں ہے جسے یا جس کے باپ کو غلامی سے آزادی ملی ہے۔

دین کے معاملہ میں اس بات پر اتفاق ہے کہ کوئی بے دین اور فاسق و فاجر شخص دین دار خاندان کی خاتون کا کفو نہیں ہے۔

مال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مالی لحاظ سے کم زور شخص دولت مند عورت کا کفو نہیں ہے۔

سماج میں بعض پیشوں کو اعلیٰ اور بعض کو ادنیٰ ہمیشہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس بنیاد پر وہ افراد اور خاندان جنھوں نے اعلیٰ پیشے اختیار کیے یا جن کو یہ حاصل رہے ان کو برتر قرار دیا گیا اور ان افراد اور خاندانوں کو ان کا کفو نہیں سمجھا گیا، جن کے پاس ادنیٰ یا معمولی پیشے تھے۔ اس کی بڑی تفصیلات ہیں کہ کس پیشے کو کس پیشے پر برتری حاصل ہے اور کن پیشوں کے درمیان کفاءت ہے اور کن پیشوں کے درمیان کفاءت نہیں ہے۔[۲]

اس پورے مسئلہ پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

اسلام نے وحدت بنی آدم کا تصور دیا ہے۔ اس کے نزدیک خاندان اور قبیلہ محض تعارف کا ذریعہ ہیں۔ انسانوں کے درمیان فضیلت اور برتری کا معیار تقویٰ اور خدا ترسی ہے۔ (الحجرات:۱۳)

---

[۱] ملا علی قاری مرقاۃ المفاتیح: ۶/ ۲۵۲

[۲] تفصیل کے لیے دیکھی جائے فتح القدیر: ۳/ ۲۹۲-۲۹۵

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے بے نظیر خطبے میں اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے۔ ہاں جس کے اندر تقویٰ اور خداترسی ہوگی وہ صاحب فضیلت ہے۔[1]

کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق آخرت سے ہے۔ وہاں فیصلہ عرب وعجم، گورے اور کالے کی بنیاد پر نہیں بلکہ تقویٰ کی بنیاد پر ہوگا، اس میں دنیا کے معاملات کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن حدیث اس خیال کی تائید نہیں کرتی ہے۔ وہ بہ ظاہر دنیا و آخرت دونوں ہی سے متعلق ہے۔ آخرت میں بھی اور اس دنیا میں بھی معیار فضیلت تقویٰ ہی ہے۔ یہ ہر دوسری چیز پر مقدم ہے۔

کفاءت کا سوال نکاح کے سلسلے میں پیدا ہوتا ہے اس ذیل میں رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

تنكح المرأة لِاَربع لمالها و لحسبها وجمالها و لدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك[2]

عورت سے نکاح چار چیزوں کی خاطر کیا جاتا ہے، اس کے مال کی خاطر، اس کے حسب کی خاطر، اس کے حسن کی خاطر اور اس کے دین کی خاطر۔ تم دین والی کو حاصل کرکے کامیاب ہوجاؤ۔ (ورنہ) تمھارے ہاتھ خاک آلود ہوں (ناکام رہوگے)۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ عام طور پر لوگ مال و دولت، حسب نسب اور حسن و جمال کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن ایک صاحبِ ایمان کی نظر، دین داری اور تقویٰ پر ہونی چاہیے اور اسے ہر دوسری چیز کے مقابلے میں دین داری ہی

---

[1] اس موضوع پر میں نے اپنے رسالے 'اسلام اور وحدتِ بنی آدم' میں اسلام کی تعلیمات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا انگریزی، ہندی اور بعض دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔ ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ١١٠٠٢٥

[2] بخاری، كتاب النكاح، باب الاكفاء فی الدين، مسلم۔ كتاب الرضاع، باب استحباب نكاح ذات الدين

کو اہمیت دینی چاہیے۔ اسی میں اس کی کامیابی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات مرد سے کہی گئی ہے۔ کیا اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ عورت کے معاملے میں بھی دین دار شخص کو ہر دوسرے شخص پر ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔

اب آیئے فقہاء کے خیالات پر غور کیا جائے۔ کفاءت کے مسئلے میں جو تفصیلات اوپر پیش کی گئی ہیں وہ فقہ حنفی کی ہیں۔ ان سب پر دیگر فقہاء کا اتفاق نہیں ہے۔ بعض بنیادی امور میں ان کے درمیان اختلافات ہیں۔ بعض باتیں فقہاء نے اپنے زمانے کے پیش نظر کہی ہیں۔ موجودہ حالات میں جوں کا توں ان کا اطلاق مشکل ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان خیالات کا زیادہ گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔

امام مالک اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک کفاءت صرف دین میں دیکھی جائے گی، باقی چیزوں کی بنیادی اہمیت نہیں ہے۔ چناں چہ ان کے نزدیک موالی (آزاد کردہ غلاموں) کا نکاح عرب خواتین سے ہوسکتا ہے۔ اس پر انھوں نے سورۂ حجرات کی مذکورہ بالا آیت سے استدلال کیا ہے۔[1] خاص بات یہ کہ فقہائے احناف میں امام کرخیؒ ان کے ہم خیال ہیں۔[2]

علامہ ابوبکر جصاص کی بھی یہی رائے ہے۔ عراق میں دوسرے مشائخ حنفیہ نے بھی ان کی اس رائے کو اختیار کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ شاید اس کی تائید میں امام ابوحنیفہؒ کا کوئی قول ان کے پاس رہا ہو۔[3]

فقہ حنفی میں کفاءت کے مسئلہ میں سب سے زیادہ اہمیت بہ ظاہر نسب کو دی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ دین اور اخلاق کی اہمیت کو بھی پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ چناں چہ کہا گیا ہے کہ کسی دین دار خاندان کی عورت کا کفو کوئی اخلاق باختہ یا فاسق و فاجر شخص نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ایک دین دار عورت شوہر کے فسق و فجور سے اس کے

---

[1] بدایۃ المجتہد: ۴/ ۲۲۸

[2] فتح القدیر: ۳/ ۲۸۳

[3] رد المحتار: ۳/ ۲۰۹

ضعفِ نسب کے مقابلہ میں زیادہ عار محسوس کرے گی۔

یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ ایک کم تر نسب کا آدمی علم وفضل کے ذریعہ اعلیٰ نسب کی عورت کا کفو ہوسکتا ہے یہاں تک کہا گیا ہے:

العالم العجمی کفو للجاهل العربی والعلویة

ایک عالم جس کا تعلق عجم سے ہے وہ کفو ہے اس جاہل کا جو عربی ہے اور نسباً علوی ہے۔

اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ علم کی فضیلت جاہ ومنصب اور دیگر خوبیوں سے بہت زیادہ ہے۔[1]

پیشوں کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں موجودہ حالات میں ان کی معنویت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ آج یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ ایک شخص کسی حقیر پیشے سے تعلق رکھنے والے خاندان میں پیدا ہوا اور وہ تعلیم پاکر آگے نکل گیا۔ اسے یا اس کی اولاد کو باپ دادا کے پیشے سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ ہوسکتا ہے کئی پشتوں سے تعلق نہ ہو، سوال یہ ہے کہ کیا پھر بھی اس کے خاندانی پیشے کی وجہ سے اسے کم تر تصور کیا جائے گا؟ بہ ظاہر یہ نہیں ہونا چاہیے۔ پھر کیوں وہ کسی سید زادی یا قریشی عورت کا کفو نہیں رہا۔ اگر علم کی فی الواقع اہمیت ہے تو اسے کفو ماننا چاہیے۔

اب صنعتوں کی بھی شکلیں بدل گئی ہیں یہ بھی دیکھا جارہا ہے جو پیشے کم تر درجے کے سمجھے جاتے تھے اعلیٰ نسب کے افراد انھیں اختیار کررہے ہیں۔ سادات سے تعلق رکھنے والے لانڈری چلاتے ہیں۔ انھیں کوئی شخص دھوبی نہیں سمجھتا۔ اسی طرح ٹیلرنگ کو جن لوگوں نے بہ طور صنعت اختیار کیا ان کو درزی نہیں خیال کیا جاتا، فرض کیجیے اعلیٰ نسب کا کوئی شخص کپڑے کا کارخانہ قائم کرتا ہے یا بڑے پیمانے پر کپڑے کا کاروبار کرتا ہے اسے بزاز (پارچہ فروش) نہیں کہا جاتا۔ قدیم فقہاء نے بھی لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کاریگر ہوں اور وہ سلائی کا کام کررہا ہو تو وہ درزی نہیں کہلائے گا۔ یہ صورت آج عام طور پر دیکھی جاتی ہے۔

---

[1] فتح القدیر: ٣/٢٨٩

فقہ میں مال کی اہمیت بھی تسلیم کی گئی ہے اور کہا گیا ہے:

ان الناس یتفاخرون بالغنی و یتعیرون بالفقر[1]	لوگ دولت و ثروت پر فخر کرتے ہیں اور غربت و احتیاج سے شرم محسوس کرتے ہیں۔

اسی بنیاد پر امیر اور غریب کو کفو نہیں سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں مالی وسائل پر قدیم زمانے کی طرح اعلیٰ طبقات کا قبضہ نہیں رہ گیا ہے۔ جن طبقات کو کم تر سمجھا جاتا ہے اس کے افراد آج ترقی کرکے پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور سائنٹسٹ بن رہے ہیں اور اعلیٰ مناصب پر پہنچ رہے ہیں۔ اس طرح کے کسی فرد کا کسی کمپنی کا منیجر یا انڈسٹری کا مالک ہونا بھی تعجب خیز نہیں رہ گیا ہے۔ آج کی دنیا میں خود عورت بھی حسب نسب سے زیادہ مال و دولت ہی کو دیکھتی ہے۔ وہ ایک قریشی اور ہاشمی کے مقابلے میں کسی ایسے شخص کو ترجیح دے گی، جو حسب نسب میں چاہے اس سے کم تر ہو لیکن اس کی مالی حیثیت مستحکم ہو۔ ان حالات میں ولی کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

کفاءت کے حق میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ عدم کفاءت کی صورت میں میاں بیوی کے تعلقات کا ٹھیک رہنا مشکل ہے۔ بلاشبہ اس کی اہمیت ہے۔ جہاں اس کا اندیشہ ہو وہاں ضرور اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کا تعلق حالات سے ہے۔ اگر کسی شریف خاندان کی لڑکی کسی ادنیٰ خاندان کے فرد سے، اس کے علم و فضل اور مالی حیثیت کے باوجود رشتہ پسند نہ کرے تو اسے اس کا حق ہے۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔ اس پر اسی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے کوئی قاعدہ کلیہ نہ بنایا جائے۔

کفاءت کے پورے مسئلہ میں دین داری، تقویٰ اور علم و فضل ہی اصل معیار ہیں، باقی دولت، پیشہ اور صنعت و حرفت کو ضمنی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے سلسلے میں انسان کا رویہ حالات کے لحاظ سے بدل جاتا ہے۔ اگر ایک شخص خدا ترس ہے اور علم و فضل کا مالک ہے تو وہ کم تر نسب کے باوجود اعلیٰ نسب کی خاتون کا کفو بن سکتا ہے۔ فقہ میں جو تفصیلات فراہم کی گئی ہیں ان سے فی الجملہ اس کی تردید نہیں ہوتی۔

---

[1] ھدایۃ مع فتح القدیر: ۳/۲۹۱

غیر مسلم عورت سے نکاح جائز نہیں

سوال:

ایک نوجوان نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔ اس کا باپ فوت ہو چکا ہے ماں حیات ہے۔ ماں نے اس کی شادی اپنی برادری کے ہندو گھرانے میں طے کر دی ہے۔ لڑکا غیر مسلم لڑکی سے شادی کرنا نہیں چاہتا، مگر ماں بہ ضد ہے اور کہتی ہے کہ تم شادی تو ہندو لڑکی سے ہی کرو گے چاہے بعد میں تم اس کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لو۔ ایسی صورت میں لڑکی اور اس کے والدین کا دباؤ بھی لڑکے پر پڑ سکتا ہے جو مزید پیچیدگی پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ لڑکی اور اس کے والدین کو لڑکا آئندہ اسلام کی دعوت دے اور وہ اسے قبول کر لیں۔ بہر حال، آئندہ کیا صورت پیدا ہوگی، ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا ان حالات کو سامنے رکھ کر برائے مہربانی شرعی مسئلہ واضح فرمائیں۔ ساتھ ہی اس سلسلہ میں اٹھنے والے مندرجہ ذیل سوالات کا جواب بھی ارسال فرمائیں:

۱- صحابہ کرامؓ کے سامنے بھی ایسی صورتیں پیش آتی رہی ہوں گی۔ ان حالات میں ان کے رشتوں کی کیا نوعیت رہی؟

۲- کیا نو مسلم لڑکا ہندو لڑکی سے شادی کر کے بعد میں مسلمان بنا لینے کی نیت سے رشتۂ ازدواج قائم کر سکتا ہے؟ اور اس درمیان اس رشتہ سے پیدا ہونے والی اولاد کی کیا حیثیت ہوگی؟ یہ باتیں وضاحت طلب ہیں۔

جواب:

گرامی نامہ ملا۔ آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام کے دورِ اول میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ازدواجی رشتے قائم ہوتے تھے۔ لیکن مدینہ پہنچنے کے بعد سورۂ بقرہ آیت (۲۲۱) اور سورۂ ممتحنہ آیت (۱۰) میں اس طرح کی شادیوں سے روک دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ مسلمان مرد کا غیر مسلم عورت سے اور غیر مسلم عورت کا مسلمان مرد سے نکاح جائز نہیں ہے۔ چناں چہ بعض ان صحابۂ کرام نے جن کے عقد میں اس وقت تک غیر مسلم بیویاں تھیں انھیں انھوں نے طلاق دے دی۔

لہٰذا اب کوئی شخص اسلام قبول کرنے کے بعد غیر مسلم عورت سے شادی نہیں کرسکتا۔ غیر مسلم عورت سے شادی کرلینے کی صورت میں اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے عقیدے پر جمے رہیں اور اختلافات اس قدر بڑھ جائیں کہ گھر چلانا دوبھر ہوجائے۔ اسی کے ساتھ اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ نو مسلم بھائی کا آہستہ آہستہ اپنی غیر مسلم بیوی سے اتنا جذباتی تعلق ہوجائے کہ اس کے لیے اسلام پر قائم رہنا مشکل ہوجائے۔ بہرحال، اسلام کی صاف ہدایات کی روشنی میں اس طرح کے نکاح کی گنجائش نہیں ہے۔ مزید تفصیل راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

محرم کے بغیر سفرِ حج

سوال:

میں ایک تحریکی بہن ہوں، میری عمر ۳۹ سال ہے۔ جماعتِ اسلامی سے الحمدللہ پانچ سال سے وابستہ ہوں۔ اس سال حج کو جانے کا ارادہ ہے۔ لیکن محرم کا مسئلہ ہے۔ پچھلے سال چھوٹے بھائی یہ فریضہ ادا کر چکے ہیں۔ دیگر دو بھائی ہیں جو فی الحال صاحبِ استطاعت نہیں ہیں۔ اس سال میرے بھائی کے برادر نسبتی، ان کی اہلیہ اور بھائی کی ساس، جو عمر رسیدہ ہیں، حج کو جا رہے ہیں۔ انھیں کے ساتھ میں نے بھی حج کا ارادہ کیا ہے۔ اور الحمد للہ حج کے لیے جو اخراجات درکار ہیں وہ بھی موجود ہیں۔ بھائی صاحب نے مقامی مفتی سے جو فقہِ حنفی کے پیرو کار ہیں، مسئلہ دریافت کیا تو مفتی صاحب نے یہ فتویٰ دیا کہ بغیر محرم کے عورت سے حج ساقط ہو جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ عورت اگر بغیر محرم کے حج کو جائے تو حج ہو جائے گا لیکن وہ گناہ گار ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ دوسرے فقہاء کے یہاں کوئی گنجائش ہے؟ براہِ کرم آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں، اللہ آپ کو اجرِ جزیل سے نوازے۔

جواب:

حج کا ارادہ مبارک ہو۔ آپ کے اندر اس کی خواہش اور ذوق وشوق فطری ہے اور ایمان کی علامت ہے۔

آپ نے دریافت کیا ہے کہ عورت کے حج کے لیے محرم کا اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے یا اس میں کوئی رعایت یا گنجائش بھی ہے؟ اس مسئلہ میں فقہاء کی رائیں بھی جاننا چاہتی ہیں۔

فقہاء کی رائیں اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ عورت کے حج کے لیے اس کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے۔ امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور امام شافعیؒ نے عورت کے لیے محرم کی شرط نہیں رکھی ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ عورتوں کی کوئی جماعت حج پر جارہی ہو تو عورت ان کے ساتھ حج کا سفر کرسکتی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ قابل اعتماد کسی ایک مسلمان عورت کے ساتھ بھی عورت کو سفر حج کی اجازت ہے۔ امام احمد سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ عورت کے فرض حج کے لیے محرم کی شرط نہیں ہے۔ ہاں، نفل حج بغیر محرم کے نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن فقہ حنبلی میں فتویٰ اسی قول پر ہے کہ عورت کے سفر کے لیے محرم کا ہونا شرط ہے۔[1]

اس تفصیل سے واضح ہے کہ بعض فقہاء کے ہاں عورت کے سفر حج کے لیے محرم کی شرط نہیں ہے۔ لیکن یہ رائے کم زور معلوم ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ اور ان کے ہم خیال فقہا کی رائے بہ ظاہر درست ہے۔ اس لیے کہ عورت کے لیے محرم کی شرط صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا يخلونَّ رجل بامراة ولا تسافرنَّ امرأة الا و معها محرم فقال رجل يا رسول الله! اكتببت فى غزوة كذا و كذا و خرجت امراتى حاجة. فقال اذهب فحُجَّ مع امرأتک[2]

کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ ہرگز خلوت میں نہ رہے، اور کوئی عورت ہرگز سفر نہ کرے جب تک اس کے ساتھ کوئی محرم نہ ہو۔ اس پر ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول (ﷺ) فلاں جنگ میں میرا نام لکھ دیا گیا ہے اور میری بیوی حج کے لیے روانہ ہوگئی ہے (قصد کرچکی ہے)۔ آپؐ نے فرمایا: اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ محرم کے بغیر آپ حج کا قصد نہ فرمائیں۔ جب اس کی صورت نکل آئے تو اسی وقت آپ پر حج فرض ہوگا۔

---

[1] فقہی آراء کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے: المغنی لابن قدامۃ، ج:۵، ص:۳۰، ۳۱، قاہرہ ۱۹۹۲)۔

[2] بخاری، کتاب الجهاد، باب من اكتتب فى جيش فخرجت امرأته حاجة۔ مسلم، کتاب الحج، باب سفر المرأة مع محرم الى حج وغيره

حضانت کا حق

سوال:

میری شادی، جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، میرے مرحوم دوست کی بیوہ سے ہوئی ہے۔ اس اقدام سے میں خوش ہوں۔ ایک سوال یہ ہے کہ مرحوم کی ایک بچی ہے، جو اب تک اپنی ماں ہی کے ساتھ رہتی تھی، لیکن اب اس کے ددھیال والے اسے لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ صورت حال ماں کے لیے تکلیف دہ ہے۔ وہ فطری طور پر پریشان ہے۔ یں بھی چاہتا ہوں کہ بچی ماں کے ساتھ ہی رہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے، اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:

سب سے پہلے تو شادی پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی ثادی سے مجھے غیر معمولی مسرت ہوئی۔ موجودہ دور میں جب کہ نکاحِ بیوگان کا رواج کم وگیا ہے اور بہت سی جوان بیوائیں بیٹھی ہوئی ہیں، اسے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ں سے ہمارے بہت سے معاشرتی مسائل حل ہوں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ونوں کو خوش وخرم رکھے اور دین کی راہ میں ایک دوسرے کا معاون اور مددگار بنائے۔

آپ نے جو مسئلہ دریافت کیا ہے، اس میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تک ں کی دوسری شادی نہ ہوجائے وہ بچہ کی پرورش کی سب سے زیادہ مستحق ہوگی۔ شادی

کے بعد اس کا یہ حق ختم ہو جائے گا۔ ہاں اس کی شادی کسی ایسے شخص سے ہو جو بچہ کے لیے محرم ہو تو اس کا حق باقی رہے گا۔ ماں کے بعد یہ حق نانی (اور پرنانی اور اوپر تک) کو حاصل ہوگا۔ پھر بچہ کی بہن اور خالہ وغیرہ آتی ہیں۔

اس لحاظ سے موجودہ صورت میں بچی کی ماں کو بچی کی پرورش کا قانونی حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ نانی کو یہ حق حاصل ہے۔ وہ اس کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ اگر آپ حضرات کوشش کریں تو امید ہے کہ لڑکی کے دادا دادی اسے نانی کے حوالہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

بچہ کی پرورش یا تربیت وغیرہ میں کوتاہی ہو تو کسی شرعی عدالت میں فیصلہ ہوگا کہ ان حالات میں شرعی لحاظ سے اس کی پرورش کا کون مستحق ہے؟

جہاں تک ماں کی تکلیف یا الجھن کا سوال ہے، ہمیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ ہمیں ہر حال میں اس کے حکم کو مقدم رکھنا چاہیے۔

زمانۂ عدّت میں ملازمت

سوال:

میں ایک مسئلہ میں قرآن و حدیث اور دورِ حاضر کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کا فتویٰ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔

میں ایک بیوہ ہوں، میرے شوہر ڈیوٹی پر جا رہے تھے کہ اچانک ان کا راستہ ہی میں انتقال ہوگیا۔ میرے دو بچے ہیں جن میں سے ایک کی عمر تقریباً سولہ سال ہے۔ ایک بچی کی عمر ۹ سال ہے۔ بچی کی پیدائش کے بعد بیماری کی وجہ سے مجھے بچہ دانی کا آپریشن کرانا پڑا۔ اس پر آٹھ سال گزر گئے۔ اس دوران مجھے کبھی حمل نہیں ہوا۔

۲- میں ایک غیر مستقل ملازم ہوں اور میرا تقرر صرف تین تین ماہ کے لیے ہوتا ہے۔ میرے اوپر گھر کی تمام ذمے داری ہے۔ میرے یا میرے شوہر کے خاندان میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو میرا اور میرے بچوں کا بوجھ برداشت کرسکے۔ میرے پاس کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد بھی نہیں ہے جس سے گزر بسر ہوسکے۔ صرف میری تنخواہ سے گزر ہوتی ہے ـــــ اور ڈیوٹی پر نہ جانے کی صورت میں میری ملازمت برقرار نہ رہ سکے گی۔ ان حالات میں میرے لیے عدت گزارنے کا کیا حکم ہے؟ دوبارہ عرض کردوں کہ میں ایک غیر مستقل ملازم ہوں۔ ڈیوٹی پر نہ جانے کی صورت میں نوکری ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔

جواب:

آپ نے جو حالات بیان کیے ہیں، ان کے پیشِ نظر آپ زمانۂ عدت میں ملازمت کے لیے دفتر جاسکتی ہیں، البتہ اپنی آمد و رفت صرف دفتر تک محدود رکھیں اور رات لازماً اپنے مکان ہی پر گزاریں۔ کسی اور عزیز وغیرہ کے مکان پر نہیں[1] اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے بچوں کو صبر جمیل سے نوازے اور آپ کی مشکلات کو دور فرمائے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے الدر المختار مع رد المحتار، ج ۲/ص ۸۵۴

عدت میں رجوع

سوال:

ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی (ایک ہی بار) مدت تین ماہ ختم ہونے سے سترہ دن پہلے رجوع کرلیا۔ ایک صاحب کو جو اس معاملہ میں پڑے تھے تاکید کردی۔ کہ وہ بیوی کو اس کی اطلاع دے دیں۔ سوال یہ ہے کہ:

۱- اگر تین ماہ گزرنے سے پہلے بیوی کو اس کی اطلاع مل گئی تو کیا یہ رجعت شرعی ہوگی؟

۲- اگر اس شخص نے وقت پر اطلاع نہیں دی اور بعد میں زوجہ کے علم میں لایا گیا تو کیا یہ رجعت معتبر ہوگی؟

جواب:

۱- اگر عدت کے اندر بیوی کو اطلاع مل گئی تو رجوع صحیح ہے۔

۲- عدت کے بعد زوجہ کو اس کی اطلاع دی گئی اور اس نے اسے تسلیم کرلیا تو رجوع صحیح ہے۔ البتہ اگر وہ اسے تسلیم نہ کرے تو رجوع صحیح نہیں ہوگا۔[۱]

---

[۱] فقہ حنفی کی معروف کتاب 'مختصر القدوری' کی عبارت ہے و اذا نفدت العدة قال کنت راجعتها فی العدة فصدقته فهی رجعة و ان کذبته فالقول قولها۔ (ہدایہ جلد ۲)

مہر ادا کرنے کی صورتیں

سوال:

پانچ شرعی مسئلے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ جواب دیں گے۔

۱- زید کے نکاح کو کئی برس ہوگئے مگر اس نے اب تک اپنی بیوی کا مہر ادا نہیں کیا۔ مہر مؤجل تھا۔ اب وہ سارا مہر یک مشت ادا کرے یا وہ مجبوری کی بنا پر ماہانہ قسطوں میں بھی ادا کرسکتا ہے؟ اس کی بیوی مہر طلب نہیں کر رہی ہے۔ وہ صرف شرعی تقاضا مکمل کرنا چاہتا ہے۔

۲- اگر بیوی پوری زندگی میں کبھی بھی اپنا مہر طلب نہ کرے تو کیا زید گناہ گار ہوگا؟

۳- کیا بیوی سے مہر معاف کرایا جاسکتا ہے؟ یہ بات معلوم ہے کہ وہ جب بھی طلب کرے گی تو شرعی تقاضے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اُسے ضرور دینا ہوگا۔

۴- اگر سونا بحیثیت مہر دیا جاسکتا ہے تو زید نے سونے کے جو زیورات نکاح کے موقعے پر بری کے طور پر دیے تھے کیا وہ مہر مانے جاسکتے ہیں جب کہ اُن زیورات کی قیمت مہر کی رقم کے برابر ہو۔

۵- کیا مہر سونے کی شکل میں یعنی زیورات کی شکل میں دیا جاسکتا ہے؟

۶- کیا مہر نقد رقم کے علاوہ کسی دوسری شکل میں بھی دیا جاسکتا ہے مثلاً جائداد۔

جواب:

آپ کے سوالات کے جوابات یہ ہیں:

۱- زید اپنی بیوی کا مہر اگر وہ موجل ہے تو زندگی میں کسی بھی وقت ادا کرسکتا ہے۔ بیوی کو اعتراض نہ ہو تو مہر قسط وار ادا ہوسکتا ہے۔ یک مشت ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔

۲- بیوی عمر بھر شوہر سے مہر کا مطالبہ نہ کرے تو اس کے مطالبہ نہ کرنے سے شوہر کیوں گناہ گار ہوگا؟ لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مہر کا ادا کرنا شوہر پر فرض ہے۔ بیوی کے مطالبہ نہ کرنے سے یہ ساقط نہیں ہوجائے گا۔ وہ مطالبہ کرے یا نہ کرے شوہر پر فرض ہے کہ خود سے اسے ادا کرے۔

۳- بیوی سے مہر معاف کرایا جاسکتا ہے۔ مہر معاف کرنے کے بعد وہ دوبارہ طلب نہیں کرسکتی۔ مہر معاف کرانے کے لیے اس پر دباؤ ڈالنا صحیح نہیں ہے۔

۴- زیورات کی شکل میں مہر دینا درست ہے۔

۵- زید نے نکاح کے وقت بیوی کو جو زیورات دیے ان کے بارے میں اگر اس نے صراحت کر دی تھی کہ مہر کے عوض دیے جارہے ہیں یا کسی جگہ عرف عام میں ان زیورات کو مہر کے عوض سمجھا جاتا ہو تو مہر ادا ہوجائے گا۔ ان دو صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہو تو وہ ہدیہ تصور کیے جائیں گے۔ مہر الگ سے ادا کرنا ہوگا۔

۶- مہر میں نقد رقم کے علاوہ مالیت رکھنے والی کوئی بھی چیز دی جاسکتی ہے۔ لہٰذا جائداد کا دینا بھی صحیح ہے۔

کاروبار میں اولاد کی شرکت

سوال:

۱- زید بسلسلۂ تجارت اپنا شریکِ کار اپنی بالغ اولاد میں سے کسی ایک کو آدھا یا چوتھائی کا بنا سکتا ہے یا نہیں؟

۲- اگر تجارت میں شریک بنا دیا ہے تو کیا اولاد مذکور اس متعین حصہ کی مالک ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۳- مذکورہ متعینہ حصہ کو اگر کل یا بعض، والد یا اولاد لے تو حقوق العباد میں گرفتار ہوں گے یا نہیں؟

۴- گھریلو اخراجات کو جانبین میں سے کوئی ایک برداشت کرے گا یا مشترکہ دولت سے؟

۵- مشترکہ نفع میں سے اگر کوئی چیز خریدی گئی تو جانبین میں سے ہر ایک حق دار ہوگا یا کوئی ایک؟

جواب:

آپ کے سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱- زید اپنی بالغ اولاد کو کاروبار میں شریک کرسکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲- جو اولاد کاروبار میں جس حد تک شریک ہے وہ اس کی مالک ہوگی۔

۳- جو اولاد جس حصہ کی مالک ہے اسے کوئی دوسرا نہیں لے سکتا۔

۴- ہر شخص اپنے بیوی بچوں کے اخراجات کا ذمہ دار ہے، لہٰذا وہ اسے برداشت کرے گا۔ اولاد اگر صاحب حیثیت ہے تو اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے اخراجات خود برداشت کرے گی۔

۵- مشترکہ نفع سے جو چیز خریدی جائے اس کا ہر حصہ دار اپنے حصہ کے تناسب سے مالک ہوگا۔ شریک اولاد بھی اپنے حصہ کے تناسب سے اس کی مالک ہوگی۔

اس طرح کے معاملات میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ دوسری اولاد کا کوئی نقصان نہ ہو اور اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے۔ ورنہ آدمی سخت گناہ گار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

چند معاشرتی مسائل

حیدر آباد کے ایک سفر میں خواتین کے اجتماع سے خطاب کا موقع ملا۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ حیدر آباد کی تعلیم یافتہ خواتین میں دین کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس کی علمی وفکری تیاری کے ساتھ ان کی زندگی میں بھی تبدیلی آرہی ہے۔ میں نے اپنے خطاب میں عرض کیا کہ آج ہر طرف شور وغوغا ہے کہ اسلام میں عورت کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔ حالاں کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج مسلمان عورت بے حد مظلوم ہے اور اس پر ہر طرح کی زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ بھی ایک مبالغہ آمیز بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات مسلمان مردوں کی طرف سے ظلم و زیادتی اور نازیبا سلوک ہوتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کی جانب سے بھی غلطیوں اور زیادتیوں کا ارتکاب ہوتا ہے، لیکن ان دونوں باتوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نے میاں بیوی کو محبت کی زنجیر میں باندھا ہے اور اس کے ذریعے خاندانی نظام کو استحکام بخشا ہے۔ مسائل اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب محبت کی یہ فضا ختم ہوجائے۔ میں نے بعض اعتراضات کا بھی جواب دیا جو اسلام کے خاندانی نظام پر بالعموم کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ سوال کیا کہ یہ بات ہم سب کے سوچنے کی ہے کہ جن لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے ہم دردی نہیں ہے، جو اس کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے وہ مسلمان عورت کے اس قدر ہم درد کیوں ہیں؟ اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کے مختلف میدانوں سے

نکالا جا چکا ہے، لیکن ابھی وہ گھر اور خاندان میں بڑی حد تک محفوظ ہے۔ اس کے دشمن اس کے اسی قلعہ کو مسمار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ عورت کو اسلام کے نظامِ خاندان کے خلاف کھڑا کر دیا جائے۔ تا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے نام سے خاندان ہی سے بغاوت کردے، شوہر اور ماں باپ کو حریف سمجھنے لگے اور اولاد کو دین سے دور کردے اور انھیں بے دینی کی راہ پر ڈال دے۔ یہ درحقیقت عورت کی ہم دردی کے پردے میں پوری ملت کو دین سے پھیرنے کی سازش ہے۔ اس پر ہم لوگوں کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ اس کے ساتھ جن لوگوں کو اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات ہیں اور وہ اسے سمجھنا چاہتے ہیں ان کو اسلامی تعلیمات سے واقف کرانا بھی ہم سب کی ذمے داری ہے۔

تقریر کے بعد خواتین کی طرف سے مسلسل سوالات سامنے آئے۔ جن سے اندازہ ہوا کہ ہماری خواتین مختلف معاشرتی مسائل پر سوچتی ہیں اور ان کا حل جاننا چاہتی ہیں۔ سوالات تحریری تھے جوابات زبانی دیے گئے۔ بعد میں انھیں برادر عزیز ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے مرتب کیا ہے۔

(جلال الدین)

سوال: (نوجوانوں میں عملی انقلاب کی تدبیر)

ذہنی انقلاب عملی انقلاب کا پہلا مرحلہ ہے۔ آج کے نوجوانوں میں فکری انقلاب تو نظر آتا ہے لیکن عملی انقلاب کم دکھائی دیتا ہے۔ اس کمی کے ازالہ کے لیے کیا تدبیر کی جانی چاہیے؟

جواب:

اگر صحیح معنی میں کسی فرد یا گروہ کا ذہن بدل جائے تو اس کی زندگی میں لازماً تبدیلی رونما ہوگی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کے اندر ذہنی انقلاب تو آجائے اور اس کی عملی زندگی میں کوئی انقلاب رونما نہ ہو۔ اس لیے ہمیں سوچنا چاہیے کہ جس ذہنی انقلاب کی ہم بات کرتے ہیں کیا وہ فی الواقع موجود بھی ہے یا نہیں؟ وہ صرف مطالعہ اور بحث و

مباحثہ ہی کا موضوع ہے یا واقعی دل و دماغ میں اتر چکا ہے۔ اگر وہ دل و دماغ میں اتر چکا ہے تو سیرت و کردار میں بھی تبدیلی آئے گی۔ اس لیے پہلی فکر اس امر کی ہونی چاہیے کہ صحیح معنی میں نوجوانوں کا ذہن بدلے۔ اس کے بعد یقیناً ان کی عملی زندگی میں بھی تبدیلی آئے گی۔

سوال: (دعوت و تبلیغ کی راہ میں میاں بیوی میں تعاون کی کمی)

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ نے اپنے خطاب میں میاں بیوی کے تعلقات پر گہری روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ زندگی کے بہت سے معاملات میں میاں بیوی مل کر اور ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہیں، لیکن اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں دونوں کے درمیان تعاون کی اسپرٹ نہیں پائی جاتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ دنیا کے تمام کاموں میں میاں بیوی ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں، لیکن جہاں دعوتِ دین اور تبلیغِ دین کے لیے جدوجہد کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں وہ ایک دوسرے کے تعاون سے دست کش ہو جاتے ہیں یا مطلوبہ تعاون نہیں کرتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے کاموں کو جتنی اہمیت دی جاتی ہے اتنی اہمیت دینی کاموں کو نہیں دی جاتی۔ اگر دینی کاموں کی اہمیت کا احساس بیدار ہوجائے تو اس کے لیے بھی دونوں کے اندر ویسی ہی فکر پیدا ہوجائے گی جیسی دنیا کے کاموں کی فکر ہوتی ہے۔

سوال: (لڑکیوں کا اسلامی حدود میں رہتے ہوئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا)

کیا آج کے دور میں لڑکیاں حدود اللہ میں رہتے ہوئے اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کرسکتیں یا پروفیشنل کورسز مثلاً میڈیکل کورس وغیرہ میں نہیں جاسکتیں؟

جواب:

اعلیٰ تعلیم کا نظم ہمارے ملک میں بالعموم مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے قائم کردہ اداروں میں بھی حدود اللہ کی پابندی کم ہی کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ آج کے دور میں طب اور دوسری پروفیشنل تعلیم حاصل کرنا عورتوں کے لیے بھی ضروری سا ہوگیا ہے۔ اس سے ایک تو کلی اجتناب ممکن نہیں ہے، دوسری طرف اس میں بہ حیثیت مجموعی امت کے نفع کے پہلو بھی ہیں۔ اس لیے ممکنہ حد تک حدود اللہ کی پابندی کے ساتھ میرے خیال میں اس طرح کی تعلیم حاصل کرنے کی لڑکیوں کو اجازت ہونی چاہیے۔ البتہ مسلمانوں کو اس کی فکر کرنی چاہیے کہ خواتین کی جدید اعلیٰ تعلیم کے لیے شرعی حدود میں کوئی نظم ہو۔

سوال: (غیر ممالک میں بغیر محرم کے عورتوں کی ملازمت)

بن بیاہی لڑکیوں کے لیے کیا یہ درست ہے کہ وہ بغیر محرم کے محض چند ٹکے کمانے کے لیے غیر ممالک میں چلی جائیں؟

جواب:

غیر شادی شدہ لڑکیاں ہوں یا شادی شدہ کسی نوجوان عورت کے لیے بغیر محرم کے طویل سفر کرنا اور غیر ملکوں میں جا کر رہنا ناجائز ہے۔ شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ جو لڑکیاں یا جوان عورتیں ایسا کرتی ہیں وہ خلافِ شرع عمل کرتی ہیں۔

سوال: (فحش کی تعریف)

اسلام میں 'فحش' کو حرام کیا گیا ہے۔ برائے مہربانی 'فحش' کی تشریح کر دیں۔

جواب:

'فحش' میں وہ تمام امور آتے ہیں جن کو صحیح انسانی فطرت بے حیائی اور بے شرمی کی باتیں سمجھتی ہے اور جن کو اسلام میں بے حیائی کے کاموں میں شمار کیا گیا ہے۔

سوال: (عورت کے ستر کے حدود)

کیا عورت کے ستر میں پاؤں کے پنجے بھی شامل ہیں؟

جواب:

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضرورت عورت کا ہاتھ اور چہرہ اجنبی مردوں کے سامنے کھل سکتا ہے۔ اس بنیاد پر فقہ میں پیر کے کھلنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ کیوں کہ ہر وقت پیروں کا ڈھکے رکھنا یا موزوں کا استعمال کرنا دشواری کا باعث ہے۔

سوال: (شوہر کا بیوی کو حج کرانا)

اگر شوہر بیوی کو اپنے خرچ پر حج کرادے تو بیوی کا فرض حج ادا ہوجائے گا یا نہیں؟

جواب:

جی ہاں! ادا ہوجائے گا۔

سوال: (آواز کا پردہ)

عورت کے لیے آواز کا بھی پردہ ہے یا نہیں؟

جواب:

عورت کے لیے اجنبی مردوں سے بلاوجہ بات چیت کرنا ناپسندیدہ ہے۔ لیکن بہت سی علمی، دینی، معاشی ضروریات کے تحت اسے بات چیت کرنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ہدایت یہ ہے کہ کسی نامحرم سے بات چیت کے وقت عورت کی آواز میں لوچ نہ ہو۔ اس کی آواز ایسی نہ ہو کہ غیر مرد کے دل میں کوئی برا خیال آئے۔ بلکہ اس کے لب و لہجہ میں کسی قدر درشتی ہو اور بات نیکی، تقویٰ اور دین و دنیا کی بھلائی کی ہو۔ ان ہدایات کو پیشِ نظر رکھ کر عورت اجنبیوں سے بات کرسکتی ہے۔

سوال: (عدت میں شادی خانہ تک جانا)

کسی عورت کی عدت کے دن پورے نہیں ہوئے۔ اسی دوران اس کے لڑکے کی شادی ہے۔ وہ شادی خانے تک جاسکتی ہے؟

جواب:

دورانِ عدت عورت صرف ناگزیر ضروریات مثلاً علاج معالجہ کے لیے گھر سے نکل سکتی ہے۔ لڑکے کی شادی میں شرکت کا شمار ناگزیر ضروریات میں نہیں ہے۔ اس لیے اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

سوال: (عورتوں کی جماعت کی امامت)

کیا عورتوں کی جماعت کی امامت عورت کرسکتی ہے؟

جواب:

فقہ حنفی کی رو سے عورتوں کی جماعت کی امامت عورت نہیں کرسکتی۔ لیکن میرے خیال میں عورتوں ہی کی جماعت ہو تو عورت امامت کرسکتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث میں نے اپنی کتاب 'عورت اسلامی معاشرہ میں' میں کی ہے۔

سوال: (برتھ کنٹرول)

برتھ کنٹرول کس حد تک درست ہے؟ جیسا کہ معلوم ہے، دو بچوں کے درمیان وقفہ کم ہونے سے ماں اور بچے دونوں کے لیے صحت اور پرورش وغیرہ کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لیے کیا مصنوعی تدبیر سے اس وقفہ کو بڑھایا جاسکتا ہے؟

جواب:

قرآن مجید نے بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال بتائی ہے۔ میری رائے میں اس عرصہ میں حمل سے بچنے کی مناسب تدابیر اختیار کرنا ناجائز نہ ہوگا۔

سوال: (ساس بہو کے جھگڑے سے بچنے کی صورت)

آج کل ساس بہو کے جھگڑوں کی شدت نے شریعت و قانون دونوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ان سے بچنے کے لیے کیا مناسب صورت اختیار کی جائے؟

جواب:

اس میں شک نہیں کہ ہماری سوسائٹی میں ساس اور بہو کے جھگڑے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ شاید بہت کم گھر اس سے محفوظ ہوں گے۔ ساس یہ سمجھتی ہے کہ لڑکا اس کا ہے اور اس کی تمام تر محبت اور توجہ اسی کی طرف ہونی چاہیے۔ جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ بہو اس کی محبت میں شریک ہو رہی ہے اور لڑکا اس کی طرف توجہ کر رہا ہے تو جھگڑے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ ساس کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ بہو اپنے کچھ حقوق لے کر آتی ہے اور ان حقوق کا ادا کرنا اس کے لڑکے کے لیے ضروری ہے۔ انھیں وہ نظر انداز نہیں کرسکتا اور یہ بھی غیر فطری بات ہے کہ کوئی عورت اپنے نوجوان لڑکے سے اس کی توقع رکھے کہ وہ اپنی بیوی سے محبت نہیں کرے گا یا تعلق نہیں رکھے گا۔ اس لیے اس واقعہ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اب اس کے لڑکے کی محبت اس کے لیے اس طرح خالص نہیں رہ سکتی جیسے لڑکے کی شادی سے پہلے تھی۔ اگر یہ احساس اس کے اندر ہو تو بہو کے ساتھ اس کے رویے میں تبدیلی آئے گی۔ دوسری طرف بہو کو بھی یہ محسوس کرنا چاہیے کہ جس طرح اس کے ماں باپ ہیں اسی طرح اس کے شوہر کے بھی ماں باپ ہیں۔ اس کا ان سے محبت کرنا، ان کی خدمت کرنا اور ان کے حقوق پہچاننا اس کے لیے ضروری ہے۔ وہ انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ شوہر سے محبت کا تقاضا ہے کہ اس کی ماں کو اپنی ماں سمجھے اور اس کی خدمت کو اپنے لیے باعث ثواب سمجھے۔ اگر یہ احساس بہو میں پیدا ہو جائے تو خوش دامن کے ساتھ تعلقات میں جو کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے اس میں یقیناً کمی آسکتی ہے۔

سوال: (کیا بہو پر سسرال والوں کی خدمت ضروری ہے؟)

شادی کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ سسرال والوں کی خدمت بہو پر فرض نہیں ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب:

قانونی طور پر سسرال کے لوگوں کی خدمت، جیسا کہ ہمارے یہاں رواج ہے، جس میں نندوں، دیوروں، جیٹھوں اور خوش دامن اور خسر وغیرہ کی خدمت لڑکی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ لڑکی کا تعلق اصلاً اس کے شوہر سے ہے۔ اس لیے اس پر قانونی طور سے ان کی خدمت کی ذمے داری عائد نہیں ہوتی، لیکن اخلاقی لحاظ سے اسے شوہر کے رشتہ داروں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اسی طرح شوہر کے رشتہ داروں کو بھی اس کی بیوی کا خیال رکھنا ہوگا اور اس کے ساتھ جبر و تشدد کی جگہ محبت کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ اسی سے ہماری معاشرت درست ہوسکتی ہے۔

سوال: (خانگی ذمے داریوں اور دعوتی کام میں ترجیح)

خواتین کو دعوتی کام کی اجازت شریعت نے خاص حدود میں دی ہے۔ لیکن بعض مواقع ایسے آتے ہیں جب دعوتی کام کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ گھر میں شوہر اور بچوں سے متعلق امور کا انجام دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کس کام کو اہمیت دینی ہوگی؟

جواب:

ایسی صورت میں شوہر اور بچوں کا حق مقدم ہوگا۔ عورت اصلاً اپنے گھر کے فرائض ادا کرنے کے بعد کوئی کام کرے گی۔ گھر کو نظر انداز کر کے دعوتی کام میں لگ جانا صحیح نہیں ہے۔ اس سے خود آگے چل کر دعوتی کام میں رکاوٹیں پیدا ہوسکتی ہیں۔

سوال: (غیر مسلم والدین کے ہاں قیام و طعام)

کیا کوئی غیر مسلم خاتون اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے غیر مسلم والدین کے

گھر رہتے ہوئے وہاں کھانا وغیرہ کھا سکتی ہے؟

جواب:

اسلام قبول کرنے کے بعد جب تک اس خاتون کا اپنا کوئی ذریعۂ معاش نہ ہو وہ اپنے والدین کے گھر رہ سکتی ہے اور وہاں کھانا بھی کھا سکتی ہے۔ البتہ ایسے کھانے جن پر غیر اللہ کا نام لیا جائے، ان سے اسے احتراز کرنا ہوگا۔

سوال: (مملکت کی سربراہ عورت کیا مردوں کی قوام ہوگی؟)

اسلام نے مرد کو قوّام بنایا ہے۔ لیکن اگر کسی مملکت میں عورت سربراہ بن جائے تو کیا مردوں پر اسے قوامیت حاصل ہوجائے گی؟

جواب:

اسلام نے خاندانی نظام میں مرد کو قوّام بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ عورت پر اسلامی ریاست کی قیادت کی ذمے داری نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس لیے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ اسلامی ریاست میں عورت سربراہ بن جائے تو وہ مردوں کی قوام ہوجائے گی۔ اس کی تشریح میری کتابوں 'عورت اسلامی معاشرہ میں' اور 'مسلمان عورت کے حقوق' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سوال: (موجودہ دور میں عورت کن آداب کے ساتھ گھر سے باہر نکلے)

اس میں شک نہیں کہ عورت شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں جہاں اخلاقی و معاشرتی برائیاں عام ہوچکی ہیں، اس اجازت سے کیسے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اور اس معاملے میں مسلمان خواتین کا کیا رول ہونا چاہیے؟

جواب:

بہت سی دینی و دنیوی ضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ عورت گھر سے

باہر نکلے۔ لہٰذا پردہ کے اہتمام کے ساتھ عورت گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ جن خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے جہاں تک ہو سکے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سوال: (طلاق شدہ عورت کی کفالت)

جیسا کہ آپ نے اپنی تقریر میں تفصیل سے بیان کیا کہ طلاق کے بعد بھی اسلامی شریعت کی رو سے عورت بے سہارا نہیں ہوتی۔ اس کے ماں باپ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں پر اس کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر طلاق شدہ عورت کے ماں باپ، اولاد یا بھائی بہن اس قابل نہ ہوں کہ اس کا بوجھ اٹھا سکیں تو پھر ایسی صورت میں اسلامی فقہ کیا کہتی ہے؟

جواب:

اس کا امکان کم ہے کہ پورے خاندان میں اس کا بوجھ اٹھانے والے افراد موجود نہ ہوں یا موجود ہوں لیکن اس کا بوجھ اٹھانے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو تو امت کی ذمے داری ہے کہ جہاں کہیں ممکن ہو بیت المال کا نظم قائم کرے، تاکہ ایسی مطلقہ یا بیوہ خواتین کا معاشی مسئلہ حل ہو۔

سوال: (فکسڈ ڈپازٹ میں رقم جمع کرنا)

کسی بیوہ عورت کو شوہر کی طرف سے کچھ رقم ملنے پر وہ اسے فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ کر اس کے نفع سے گزارہ کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ اسے کاروبار میں لگانا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

جواب:

یہ صاف سود ہے، اس سے ہر مسلمان کو بہر حال اجتناب کرنا چاہیے۔ کسی ایسے کاروبار میں پیسہ لگانا چاہیے جس میں خطرہ کا امکان کم سے کم ہو۔

سوال: (بزنس میں نفع و نقصان میں شرکت ضروری ہے)

آج کل لوگ بزنس میں صرف Profit میں حصہ دار ہونا چاہتے ہیں۔ بزنس کے مالک کو، چاہے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے، حصہ لینے والے کو پوری رقم دینی پڑتی ہے۔ کیا یہ جائز ہے؟ بعض اوقات خسارہ کی صورت میں بزنس کے مالک کو مجبوراً قرض لے کر حصہ دار کو رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ بزنس میں شریک ہونے والے Loss and Profit دونوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں یا نہیں؟

جواب:

کسی بزنس میں جو لوگ شریک ہوں وہ Loss and Profit کی بنیاد پر شریک ہوسکتے ہیں۔ صرف Profit کی شرط لگانا اور Loss کو قبول نہ کرنا شریعت کی رو سے درست نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا سود ہے۔

سوال: (قربانی کا گوشت غیر مسلم کو تحفے میں دینا)

کیا قربانی کا گوشت غیر مسلموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یا بہ طور تحفہ دیا جاسکتا ہے؟

جواب:

جی ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال: (ٹی، وی کے استعمال کا حکم)

بعض حضرات ٹی وی کو ناجائز و حرام قرار دیتے ہیں، جب کہ اس کا شمار ذرائعِ ابلاغ میں ہوتا ہے۔ کیا ٹی وی پر معلوماتی و اصلاحی پروگرام دیکھے جاسکتے ہیں؟ اس کے منفی و مثبت پہلوؤں کو اجاگر کیجیے۔ اس پر جو تصاویر مردوں اور عورتوں کی آتی ہیں ان کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:

ٹی وی ابلاغ کا ایک ذریعہ ہے، لیکن یہ چوں کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے

جو دینی اور اخلاقی حدود کے پابند نہیں ہیں اس لیے ان میں زیادہ تر پروگرام ایسے آتے ہیں جو اسلام کی تعلیمات اور اس کے قائم کردہ حدود و آداب کے خلاف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض اوقات بہت مفید معلوماتی اور اصلاحی پروگرام بھی آتے ہیں۔ ان میں بھی مردوں اور عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان پروگراموں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ البتہ جب نامحرم کی تصویر سامنے آئے تو اس وقت ممکنہ حد تک غضِّ بصر سے کام لیا جائے۔

کتابیات

کتاب میں جہاں قرآن مجید کی آیات آئی ہیں ان کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ جن کتبِ مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے حوالے حواشی میں ہیں۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے کتاب اور مصنف کا پورا نام، اس کا سن وفات، کتاب کے پیش نظر نسخے کے مطبع اور سن طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے تاکہ مراجعت میں آسانی ہو۔

نظر ثانی کے دوران میں بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن پیش نظر رہے ہیں۔ یہاں کسی ایک ایڈیشن ہی کی تفصیل پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ ان کے مطابع وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

تفسیر

۱- ابن جریر (جامع البیان فی تفسیر القرآن) ابوجعفر محمد بن جریر الطبری م۳۱۰ھ، تحقیق محمود محمد شاکر، دارالمعارف مصر ۱۹۷۱ء

۲- الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، ابو القاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری م۵۳۸ھ

۳- الجامع لاحکام القرآن، ابوعبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر ابن فرح القرطبی (المالکی) ۱۴۱۷ھ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۸۸ء

۴- بیضاوی (انوار التنزیل و اسرار التاویل) القاضی ناصر الدین البیضاوی م ۶۸۵ھ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۸۸ء
۵- تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب) فخر الدین محمد بن عمر الرازی م ۶۸۴ھ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۰ء
۶- بغوی (معالم التنزیل) ابومحمد محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی م ۵۱۶ھ
مع
۷- خازن (لباب التاویل فی معانی التنزیل) علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی م ۷۴۱ھ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۵ء
۸- ابن کثیر (تفسیر القرآن العظیم) عماد الدین اسماعیل م ۷۷۴ھ، دارالمعرفۃ، بیروت۔ ۱۹۶۹ء
۹- البحر المحیط، ابوحیان اندلسی ۷۵۴ھ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۲ء

حدیث وشرحِ حدیث

۱۰- صحیح بخاری (الجامع الصحیح) محمد بن اسماعیل البخاری م۲۵۶ھ
۱۱- صحیح مسلم، ابوالحسین مسلم بن الحاج م ۲۶۱ھ
۱۲- جامع ترمذی ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی م ۲۷۹ھ
۱۳- سنن ابی داؤد، ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی م ۲۷۹ھ
۱۴- مشکوٰۃ المصابیح، ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی م ۷۳۷ھ
۱۵- شرح مسلم، الامام یحییٰ بن شرف النووی م ۶۷۷ھ، دارالکتب العلمیۃ لبنان ۱۹۹۵ء
۱۶- مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ملاعلی قاری، دارالفکر بیروت لبنان ۱۹۹۴ء
۱۷- نصب الرایۃ (تخریج احادیث الھدایۃ) جمال الدین ابو محمد یوسف الزیلعی م ۷۶۲ھ مع الھدایۃ۔ دار الکتب العلمیۃ لبنان ۱۹۹۶ء

فقہ

۱۸- الھدایۃ شرح بدایۃ المبتدی۔ برھان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی ۵۹۳ھ

مع

۱۹- فتح القدیر کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الھمام الحنفی م۶۸۱ھ
دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۵ء

۲۰- الدر المختار شرح تنویر الابصار، علاء الدین الحنفی م ۱۰۸۸ء

مع

۲۱- رد المحتار علی الدر المختار۔ محمد امین ابن عابدین م۱۸۳۶ء دارالکتب العلمیۃ، بیروت
۱۹۹۴ء

۲۲- المغنی علی مختصر ابی القاسم الخرقی، ابومحمد عبد اللہ بن احمد بن قدامہ المقدسی، م ۶۲۰ھ،
مکتبہ الریاض الحدیثۃ ۱۹۸۱ء

۲۳- بدایۃ المجتھد و نھایۃ المقتصد۔ القاضی ابو الولید محمد بن احمد ابن رشد القرطبی،
م۵۹۵ھ، دارالکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۶ء

سیرت و تاریخ

۲۴- السیرۃ النبویۃ ابن ھشام، م۲۱۸ھ، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۴ء

۲۵- الطبقات الکبریٰ۔ ابن سعد، دار صادر، بیروت

۲۶- تاریخ الامم والملوک، محمد بن جریر الطبری، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۷ء

۲۷- السیرۃ النبویۃ، عماد الدین اسماعیل بن کثیر الدمشقی، دار المعرفۃ، بیروت ۱۹۸۳ء

۲۹- الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد عبد البر القرطبی۔
دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۵ء

۳۰- اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ۔ ابن الاثیر الجزری، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۶ء

لغت

۳۱- لسان العرب۔ ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور المصری۔ دار صادر، بیروت ۱۹۹۴ء

۳۲- القاموس المحیط۔ مجد الدین محمد بن یعقوب الفیروز آبادی۔ م۸۱۷ھ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۲۰۰۴ء

☆☆